تحفۃ الشعراء بارہویں صدی ہجری کے نصف آخر کے ابتدا کی تصنیف ہے، وہ اپنی قدامت کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں ہندوستان کے ۶۲ شعراء کا ذکر ہے، جن میں بعض فارسی کے شاعر ہیں اور بعض فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، کتاب کا اختتام مرزا مظہر جان جاناں کے تذکرے پر ہوا ہے، ادارہ ادبیات اردو قابل تحسین ہے کہ اس کے ذریعہ ایک نادر ادبی تحفہ اہل علم تک پہنچ گیا۔ اس میں شعراء کے بارے میں بعض نئی معلومات اور رائیں ملتی ہیں، جس سے اس کی افادیت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔

مجموعۂ کلام شفیق جونپوری } مرتبہ عزیز ربانی عزیزؔ، صفحات ۱۴۴، کتابت وطباعت معمولی، قیمت ۶؎ پتہ: اڈیٹر ہفتہ وار اردو دنیا، جونپور

شفیق جونپوری مرحوم ہندوستان کے ان ممتاز شعراء میں تھے جو اپنا ایک اچھوتا رنگ رکھتے تھے، مذہبیت کے ساتھ شاعرانہ ذوق...... ان کو اپنے والد جناب انیق جونپوری سے ورثہ میں ملا تھا، ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں پُر حکمت و پُر کیف ہوتی ہیں، مگر ان کا اصل رنگ غزل میں نمایاں ہوتا ہے، ان کی غزلیں تغزل کی لفظی و معنوی خوبیوں کے ساتھ درد و سوز اور حکیمانہ خیالات و احساسات سے بھی پر ہوتی ہیں، اس سے پہلے ان کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، اس مجموعہ میں انکی زندگی کے آخری حصہ کے کلام کو عزیز ربانی نے جمع کر دیا ہے۔

"م۔ ج"

جلد ۹۲ - ماہ ربیع الاول ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۶۳ء عدد ۲

مضامین

مقالات

آثار علمیہ و ادبیہ

ادبیات

شذرات

مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی تحقیقات کے لیے مرکزی حکومت جو کمیٹی بنانے والی تھی، اس کے خلاف مسلمانوں کے عام احتجاج اور خصوصاً نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی صدارت میں مسلمان عمائد کا جو اجتماع ہوا تھا اس کے مشورے سے متاثر ہو کر اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا ہے، لیکن یہ کوئی وقتی مسئلہ نہیں ہے جو ٹالنے سے ٹل جائیگا، آج پوری دنیا میں مغربی خیالات کی جو رو چل رہی ہے جس نے اسلامی ملکوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے اس سے ہندوستان کے مسلمانوں خصوصاً انکی نئی نسل کا متاثر ہونا لازمی ہے، اس سے قطع نظر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جدید تمدن نے زندگی کے مختلف شعبوں میں ایسے مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کا وجود ہماری پرانی فقہ میں نہیں ہے، اور مسلمانوں کا ایک طبقہ ایمانداری سے ان کا اسلامی حل چاہتا ہے جب اس کو اس میں مایوسی ہوتی ہے تو وہ دوسری راہیں تلاش کرتا ہے، اسی سے مغرب زدگی، تجدد پسندی، ملحدانہ خیالات اور ملحدانہ تحریروں کو پھیلنے کا موقع ملتا ہے، اس کے روکنے کی صورت صرف یہ ہے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں ان مسائل و مشکلات کا حل نکالا جائے، نئے تقاضوں کا جواب اور نئے طبقہ کی تشنگی کا سامان مہیا کیا جائے، اسکے بغیر اس سیلاب کا روکنا ناممکن ہے۔

اصل میں یہ کام اسلامی حکومتوں کے کرنے کا تھا، مگر بعض تو پرانی لکیر کی فقیر ہیں اور اس سے ایک انچ آگے بڑھنا نہیں چاہتیں، اور بیشتر خود مغربی تمدن کی اسیر اور مغربی خیالات میں غرق ہیں، اس لیے ان سے اسکی توقع نہیں، ان کے مقابلہ میں ہندوستان کے مسلمان بہت غنیمت ہیں اس لیے یہاں کے علماء پر بھی یہ فرض کفایہ عائد ہوتا ہے، اس ضرورت کا احساس ہمیشہ علماء کو رہا اور اس کے لیے جزوی اور انفرادی کوششیں بھی ہوئیں لیکن مختلف اسباب

و موانع کی بنا پر ابتک کوئی اجتماعی کوشش نہ ہو سکی، مولانا سید ابو الحسن علی نے جن کو اللہ تعالیٰ نے دین و ملت کی خدمت کی خاص سعادت عطا فرمائی ہے، اس اہم اور ضروری کام کی جانب بھی پیشقدمی کی ہے، اور فی الحال ابتدائی صلاح و مشورے کے لیے مختلف مکاتب فکر کے مخصوص علماء کو یکم ستمبر کو ندوۃ العلماء لکھنؤ میں اجتماع کی دعوت دی ہے، اس کے بعد پھر وسیع قدم اٹھایا جائیگا، یہ کام کسی خاص جماعت یا طبقہ کا نہیں بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے مفاد کا ہے، اس لیے یقین ہے کہ علماء اس میں پورے تعاون سے کام لیں گے، گو یہ کام دیر سے شروع ہوا ہے لیکن جب کسی راہ میں ایک قدم اٹھ جاتا ہے تو بہت سے رکے ہوئے قدم اٹھ جاتے ہیں، اس لیے انشاء اللہ دیر آید درست آید کا مصداق ہوگا۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ایک زمانہ میں مسلمانوں کی بہت مفید تعلیمی خدمات انجام دے چکی ہے، لیکن ادھر مدتوں سے ایک بیجان ادارہ بنکر رہ گئی تھی، اور اتنے عرصہ سے اس کا نام بھی سننے میں نہیں آتا تھا، غالباً اس میں ملک کے نئے حالات کو بھی دخل تھا، کانفرنس جن حالات اور جن مقاصد کے لیے قائم ہوئی تھی ان کے لحاظ سے آج پہلے سے کہیں زیادہ اس کی ضرورت ہے، کانفرنس کا خاص مقصد مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح و ترقی خصوصاً ان میں جدید تعلیم کی اشاعت تھا، اب حالات بدل گئے ہیں، زمانہ خود ان کو جدید تعلیم کی طرف مائل کر چکا ہے اور اس کے بجائے دوسرے تعلیمی مسائل درپیش ہیں، اس وقت سب سے بڑا مسئلہ مسلمان بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم و تربیت کا ہے، سرکاری تعلیم تمام تر ہندو مذہب، ہندو تہذیب اور ہندو روایات کی ترجمان ہے، جس کو مسلمانوں کی تہذیب و روایات سے کوئی علاقہ نہیں ہے، اور مسلمان بچے اس کو حاصل کرنے پر مجبور ہیں، اس لیے اگر مسلمان ان کی مذہبی تعلیم و تربیت کا خود مستقل نظام قائم نہیں کرتے تو وہ اپنے مذہب اور اپنی تہذیب و روایات سے بالکل بیگانہ ہو جائیں گے۔

دینی تعلیمی کونسل اور دینی تعلیمی بورڈ اس کام کو انجام دے رہے ہیں، لیکن یہ کام اتنا وسیع ہے کہ

اس میں دوسری جماعتوں کے بھی کام کی گنجایش ہے۔

ان حالات میں اس خبر سے بڑی مسرت ہوئی کہ مسلم ایجوکیشنل کی نشأۃ ثانیہ ہو رہی ہے، اور اس کا اجلاس بمبئی میں ہونے والا ہے، لیکن اس کے گذشتہ اجلاسوں کی طرح محض جلسہ کرکے محض چند تجویزیں پاس کر دینا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو ایک عملی اور جاندار ادارہ بنانے کی ضرورت ہے، عملی کام کے بغیر کوئی ادارہ زندہ نہیں رہ سکتا، اس لیے خود کانفرنس کی بقا کے لیے عملی پروگرام ضروری ہے، اور اس وقت سب سے اہم تعلیمی مسئلہ مسلمان بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کا ہے، اس لیے ایجوکیشنل کانفرنس کو اس کی جانب بھی توجہ کرنی چاہیے، اور اس میں پورا عملی حصہ لینا چاہیے۔

حکومت سہ لسانی فارمولے کو جس شکل میں نافذ کرنا چاہتی تھی، نئے سال سے اس کو جاری کر دیا، اسکا مقصد صرف یہ ہے کہ کہنے کے لیے اردو کی تعلیم کی گنجایش بھی رکھی جائے لیکن شکلیں ایسی اختیار کیجائیں کہ اسکی تعلیم کا دروازہ عملاً بند ہو جائے، سنسکرت کو سہ لسانی فارمولے میں شامل کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اسکی تعلیم کا انتظام تو ہر اسکول میں ہو جائیگا، اور اردو کا مشکل سے کچھ اسکولوں میں ہو سکے گا، اس طرح اردو کی تعلیم خود بخود ختم ہو جائیگی، اردو کے معاملہ میں حکومت سے کسی انصاف کی توقع رکھنا محض خوش فہمی ہے، اگر اردو کے حامی اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں تو اسکی صورت صرف یہ ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اردو ہے وہ اردو لینا اپنا فرض بنا لیں، خواہ اس میں ان کو کچھ نقصان ہی برداشت کرنا پڑے، اگر اردو پڑھنے والے طلبہ قابل لحاظ تعداد میں ہو جائیں تو سب میں نہ سہی کچھ نہ کچھ اسکولوں کو اردو کی تعلیم کا انتظام کرنا پڑیگا، مگر سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ ابتدائی سے لیکر اعلیٰ تعلیم گاہوں تک جہاں جہاں اردو کی تعلیم کا انتظام ہے، اردو کے طلبہ کی تعداد برابر گھٹتی جاتی ہے، مسلم اسکولوں میں بھی یہی افسوسناک حالت ہے، ایسی حالت میں تنہا حکومت کی شکایت کرنا بیکار ہے، اس میں طلبہ اور ان کے والدین کا بھی قصور ہے۔

مقالات

تیموری دور کی خطاطی
اور
مشہور خطاط

از شاہ معین الدین احمد ندوی

خطاطی کی اہمیت ایک زمانہ میں خوشنویسی و خطاطی بھی بڑا کمال سمجھی جاتی تھی، اور اس نے باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل کر لی تھی، اس کے اصول و قواعد تھے، دوسرے علوم و فنون کی طرح اس کی بھی مشق و تعلیم ہوتی تھی، اس کے بغیر تعلیم مکمل سمجھی جاتی تھی، سلاطین و امرا تک کے لڑکوں کو خطاطی کی تعلیم دیجاتی تھی، تیموری سلاطین میں شاہ جہاں، اورنگ زیب، دارا شکوہ، شہزادوں میں خسرو، پرویز اور آخر میں بہادر شاہ اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، خوشنویسوں کی بڑی قدر و منزلت تھی، وہ سلاطین و امرا کے درباروں کی زینت ہوتے تھے، نامور اساتذہ اور مشہور خطاطوں کی لکھی ہوئی کتابیں بلکہ رباعیات اور قطعات تک بڑی گراں قیمت پر فروخت ہوتے تھے،

مسلمان جب ہندوستان آئے تو دوسرے علوم و فنون کی طرح خطاطی کو بھی ساتھ لائے، اور ان کے زمانہ میں خصوصاً مغلوں کے دور میں دوسرے فنونِ لطیفہ کی طرح خطاطی میں بھی بڑی ترقی ہوئی اور یہاں بڑے بڑے خطاط اور خوشنویس پیدا ہوئے،

مسلمانوں میں خطاطی کی ترقی کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ اسلام میں مصوری حرام ہے، اس لیے

جن مذہبی لوگوں میں مصوری اور نقاشی کا ذوق تھا، انھوں نے اس کو پورا کرنے کے لیے نقاشی اور خطاطی کی طرف توجہ کی اور مصوری کی طرح اس میں طرح طرح کی نزاکتیں اور دلفریبیاں پیدا کیں جن کے سواد تحریر سے آج بھی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

اسلام میں خطاطی کی تاریخ ظہور اسلام کے وقت عرب میں خط نبطی (حیری) رائج تھا، جو بعد میں خط کوفی کہلایا، اور عہد رسالت میں اسی کا استعمال ہوتا تھا، کلام مجید بھی اسی میں لکھا جاتا تھا، اس کے حروف حسن و نفاست اور نقطوں اور اعراب سے معرّیٰ تھے، عربی عربوں کی مادری زبان تھی، اس لیے وہ نقطوں اور اعراب کے بغیر انکو صحیح پڑھ لیتے تھے لیکن جب عجمی قومیں مسلمان ہوئیں اور وہ حروف کے تلفظ اور اعراب میں غلطی کرنے لگیں تو حضرت علیؓ کے ایک شاگرد ابوالاسود دوئلی نے ہم شکل مگر مختلف المخارج اور مختلف الاصوات حروف، ب، ت، ث، ج، ح، خ، د، ذ، ر، ز، س، ش، ص، ض، ط، ظ، ع، غ کے تلفظ میں فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لیے نقطے ایجاد کیے،[1]

بنی امیہ کے ابتدائی دور تک یہی طریقہ رائج رہا لیکن نقطے بھی ہم شکل ہوتے تھے، ان میں بھی التباس ہوتا تھا اس لیے پہلے مختلف مقصد کے نقطوں میں رنگ کے ذریعہ فرق پیدا کرنے کی کوشش کی گئی، مگر جب یہ بھی ناکافی ثابت ہوا تو عبد الملک کے زمانہ میں حجاج بن یوسف ثقفی نے حروف کے امتیاز کے لیے تو نقطے قائم رکھے لیکن حرکات کی صحت کے لیے اعراب کی علامتیں ایجاد کیں،[2] پھر آگے چل کر مخارج کی مزید صحت کے لیے فن تجوید ایجاد ہوا۔

ان تغیرات کے ساتھ خط کوفی کی ظاہری شکل میں بھی تبدیلی ہوتی رہی اور تیسری صدی کے آخر تک اس کے حسن میں نمایاں اضافہ ہوا، اور اس کے بڑے بڑے کاتب پیدا ہوئے، جنھوں نے اس کے مختلف طرز ایجاد کر کے بڑا تفنن پیدا کیا، ابن ندیم نے اس کی پوری تفصیل لکھی ہے، لیکن اس خط میں کوئی بنیادی

[1] فہرست ابن ندیم ص ۶۰، اعراب و اعجام کے موجدین کے نام میں بڑا اختلاف ہے، بعض اسکو حجاج بن یوسف کی طرف منسوب کرتے ہیں۔
[2] ابن خلکان ج اول ص ۲۲۱ [3] ایضاً ج اول ص ۲۲۱ [4] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو فہرست ابن ندیم ص ۱۱۱ و ۱۱۲

تبدیلی نہیں ہوئی، البتہ وہ خط کوفی کہلانے لگا، تا آنکہ مقتدر باللہ عباسی ~~۲۹۵~~ ~~۳۲۵~~ھ کے زمانہ میں ابو علی محمد بن علی المعروف با بن مقلہ پیدا ہوا، یہ بڑا فاضل منشی اور ادیب تھا، مقتدر کے زمانہ میں وزارت کے درجہ تک پہنچا، یہ اعلیٰ درجہ کا خطاط بھی تھا اس نے خط کوفی کو ترقی دیکر ایک نیا خط ایجاد کیا جو اپنے حسن و نفاست میں ضرب المثل تھا،[1] اس کا نام اس نے بدیع اور محقق رکھا، پھر اس سے خط ثلث و ریحان ایجاد کیے،[2] بدیع و محقق ہی نے آگے چل کر خط نسخ کی شکل اختیار کر لی، یہ خط اس قدر خوبصورت تھا کہ گویا گذشتہ خطوں کا ناسخ تھا، اس لیے نسخ کہلایا، یہ خط کتابوں اور عام تحریروں میں اور ثلث و ریحان زیادہ تر کتبات و سرخیوں کے لیے استعمال ہوتے تھے، ابن مقلہ کے بعد علی بن ہلال المعروف بہ ابن بواب المتوفی ۴۲۳ھ پیدا ہوا، یہ بھی اپنے زمانہ کا نامور خطاط تھا، اس نے خط بدیع و محقق کو اور ترقی دے کر اس میں مزید حسن و نفاست اور خوبی و زیبائی پیدا کی،[3] غالباً اسی زمانہ سے یہ خط نسخ کہلایا،

اپنے زمانہ میں اس خط کا سب سے بڑا ماہر خود ابن بواب تھا، ملا کاتب چلپی کا بیان ہے کہ ان دونوں کے زمانوں میں چھ خط ایجاد ہوئے، ثلث، نسخ، تعلیق، ریحان، محقق (بدیع) اور رقاع۔ یہی چھ خط سب سے زیادہ مقبول اور رائج تھے، ابن مقلہ اور ابن بواب کے بعد خطاطی میں سب سے زیادہ شہرت اور ناموری یاقوت حموی رومی المتوفی ۶۲۶ھ، صاحب معجم الادبا، اور یاقوت بن عبد اللہ رومی مستعصمی المتوفی ۶۹۸ھ نے حاصل کی خصوصاً یاقوت مستعصمی سب پر گوئے سبقت لے گیا، اس کے زمانہ میں خط نسخ میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا، اس کا خط اس قدر مقبول تھا کہ اس کے لکھے ہوئے صفحات سونے کے پتر کے بھاؤ بکتے تھے، آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ کا درباری خوشنویس تھا، اس کے خط کی مقبولیت اور قدر دانی کو دیکھ کر دوسرے خطاطوں نے سیکڑوں کتابیں اور کلام مجید

[1] الفخری ص ۲۴۴ [2] پیدائش خط و خطاطان، حاجی مرزا عبد المجید خاں ایرانی ص ۲۹ [3] ابن خلکان ج ۲ ص ۳۱

لکھکر اس کے نام سے منسوب کر دیے، جو محض اس کی نسبت سے بڑی گراں قیمت پر فروخت ہوتے تھے، ان کے علاوہ اس زمانہ میں اور بھی مشہور خوشنویس پیدا ہوئے، صاحبِ کشف الظنون نے ان کے نام لکھے ہیں[1]،

خط کی ترقی اور ان کی ایجادات کے ساتھ ساتھ خطاطوں نے اس کی کتابت کے اصول و قواعد بنائے، ان پر مستقل کتابیں لکھیں، قلم تراشی، روشنائی سازی، کاغذ وغیرہ، آلات کتابت کی ترکیبیں تحریر کیں۔ اس طرح خطاطی نے مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی، ابن ندیم، طاش کبریٰ زادہ اور ملا کاتب چلپی نے ان سب کی تفصیل لکھی ہے لیکن ہمارا مقصد صرف ہندوستان میں خطاطی کی مختصر تاریخ لکھنا ہے، اس لیے ان تفصیلات کو قلم انداز کیا جاتا ہے،

نستعلیق کی ایجاد ساتویں صدی کے وسط تک مذکورۂ بالا خطوط، خصوصاً خط نسخ کا زیادہ رواج رہا، عربی اور فارسی دونوں کی کتابیں اسی میں لکھی جاتی تھیں، ساتویں صدی میں خط نسخ اور تعلیق کو ملا کر ایک نیا خط ایجاد ہوا، جو نوک پلک کے لحاظ سے خط نسخ سے بھی زیادہ خوبصورت تھا، اس کی ایجاد خواجہ میر علی تبریزی کیجانب منسوب کیجاتی ہے، قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں اس کی شان میں مولانا سلطان علی مشہدی کا ایک قصیدہ نقل کیا ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں:

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی است
واضع الاصل خواجہ میر علی است

وضع فرمود او ز ذہن دقیق
از خطِ نسخ و از خطِ تعلیق

یہ خط ابتدا میں نسخ و تعلیق کہلاتا تھا، پھر کثرتِ استعمال سے نستعلیق ہو گیا[2]۔

لیکن صحیح یہ ہے کہ خط نستعلیق اس سے پہلے ایجاد ہو چکا تھا، ابو الفضل کا بیان ہے:

"نستعلیق و آں تمام دور است در زمان صاحبقراں خواجہ میر علی تبریزی از نسخ و تعلیق

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو کشف الظنون ج اول ص ۶۶۷ [2] تذکرۂ خوشنویساں مولوی غلام محمد ہفت قلم ص ۴۲

بر گرفت و ایں با در نشو د چرا کہ نا مہا بنظر در آمد کہ پیش از صاحبقران نگاشتہ بودند[1]"

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط نستعلیق خواجہ میر علی تبریزی سے پہلے ایجاد ہو چکا تھا، البتہ انھوں نے اس میں حسن و نفاست پیدا کی اور اس کے قواعد مرتب کیے[2]، اس لیے یہ مسلم ہے کہ خط نستعلیق کے پہلے ماہر فن استاد خواجہ میر علی تبریزی تھے،

خواجہ میر علی کے شاگردوں میں مولانا جعفر تبریزی اور مولانا اظہر نے خطاطی میں بڑا کمال پیدا کیا اور بڑی شہرت و ناموری حاصل کی، ان کے علاوہ اس دور کے خطاطوں میں مولانا محمد ادہمی، مولانا باری ہروی اور مولانا سلطان علی مشہدی تھے، خصوصاً مولانا مشہدی اپنے زمانہ کے یگانہ خوشنویس تھے، ان کے شاگردوں میں سلطان محمد خنداں، سلطان محمد نور، مولانا علاء الدین ہروی، مولانا زین الدین، مولانا عبیدی نیشاپوری اور محمد قاسم شادی شاہ نے خوشنویسی میں شہرت حاصل کی، ان میں ہر شخص اس فن میں صاحب طرز تھا، ان کے بعد مولانا میر علی ہروی امام فن ہوئے جنھوں نے مولانا مشہدی کے جیسے یگانۂ روزگار کے فن کو بھی مزید ترقی دی[3]، یہ سب ایران کے کاتب تھے،

خط کی قسمیں یوں تو خط کی بہت سی قسمیں ہیں، ان میں زیادہ مشہور سات ہیں: نسخ، نستعلیق، رقاع، ثلث، ریحان، شفیع، اور شکست۔ جن کے ماہرین ہفت قلم کہلاتے تھے، طغرا نویسی اس سے علٰحدہ تھی۔ ان خطوں میں خطاطوں نے اور طغرا نویسوں نے اتنا تفنن اور ایسی صناعیاں پیدا کیں کہ خط نے تصویر، نقش و نگار اور گل بوٹے کی جگہ لے لی، چنانچہ ایک زمانہ میں خوشخط لکھے ہوئے، قطعات، رباعیات، حکیمانہ مقولے اور آیات قرآنی کے طغرے، وغیرہ سامان آرایش میں تھے جن سے زیب و زینت کے ساتھ اخلاقی سبق اور پند و موعظت کا بھی فائدہ حاصل ہوتا تھا، اس کے آثار اب بھی کہیں کہیں باقی ہیں۔

آجکل مصوری کے نمونوں سے جو کام لیا جاتا ہے اور اس کی جو قدر ہے ایک زمانہ میں یہی قدر خطاطی

---

[1] آئین اکبری ج اول ص ۵، [2] تذکرۂ خوشنویساں [3] آئین اکبری جلد اول ص ۵،

کے نمونوں کی تھی،

تیموری عہد میں خطاطی مسلمان جب ہندوستان آئے تو خطاطی اور خوشنویسی کو بھی ساتھ لائے لیکن سلاطین دہلی کے زمانہ تک زیادہ تر ایرانی خوشنویسوں ہی کی تقلید رائج رہی، اور خود ہندوستانیوں نے ان میں کوئی جدت نہیں پیدا کی، جب مغلوں کا دور شروع ہوا تو انھوں نے دوسرے فنون لطیفہ کی طرح خوشخطی اور خطاطی کی بھی بڑی قدردانی اور سرپرستی کی۔ اور ان میں سے اکثر سلاطین خود بھی اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے۔ اور اپنے لڑکوں کو دوسرے فنون کی طرح خوشخطی کی تعلیم بھی دلاتے، مشہور خطاطوں کی قدردانی کرتے تھے، ان کی لکھی ہوئی تحریروں کو گراں قیمت پر خریدتے تھے، اس کے علاوہ ان کی علم دوستی اور حکومت کی ضروریات بھی خطاطی کی ترقی میں معاون ہوئیں، تیموری خاندان اور اس کے امراء تک علم و فن کے بڑے قدردان تھے، ان کا کتب خانہ بڑا وسیع تھا، اس کی کتابوں کی کتابت، ظاہری زینت و آرائش اور مصوری کے لیے خوشنویسوں، نقاشوں اور مصوروں کا پورا عملہ رہتا تھا، عمارتوں کی تحریروں اور کتبات کے لیے اعلیٰ درجہ کے خطاطوں اور طغرانویسوں کی ضرورت تھی، ان کا نظام حکومت اور اس کے دفاتر (سکریٹریٹ) بہت وسیع تھے اس میں سیکڑوں کاتب اور منشی کام کرتے تھے، ان کاتبوں خصوصاً شاہی فرمان نویسوں کے لیے خوشخطی ضروری تھی، ان اسباب کی بنا پر ان کے دور میں خوشخطی اور خطاطی کو بڑی ترقی ہوئی اور بڑے بڑے خوشنویس پیدا ہوئے، تیموریوں کے ابتدائی دور یعنی اکبر کے زمانہ کے بارہ میں ابوالفضل لکھتا ہے:-

"از قدردانی و ارزشناسی کشور خدائے گوناگوں خطہا پایہ والا گرفت و ہنرپردازان نادرۂ روزگار روز بازار شد، خاصہ نستعلیق روائی دیگر یافت و جادو رقمے کہ در ظل سریر خلافت صاحب ایں نقش دلپذیر تواں گفت محمد حسین کشمیری است و بخطاب زریں رقمی روشناس آفاق شاگرد مولانا عبد العزیز از استاد گذرانیدہ، مدات د

دوائر متناسب ودو وائرا و ہم متناسب ہم اندکار آگہان او دابا پایہ میر علی برگیرند و مولانا باقر پسر میر علی مشہور، و محمد امین مشہدی، میر حسین کلنگی، مولانا عبد الحئی، مولانا دوری مولانا عبد الرحیم، میر عبد اللہ، نظامی قزوینی، علی چمن کشمیری، نوراللہ قاسم ارسلان فروغ دولت جاوید طراز نامور گشتند"[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے:-

تیموری دور کے خطاط اکبری دور کے امراء میں عبد الرحیم خانخاناں بڑا صاحب ذوق، علم پرور اور ہنرنواز امیر تھا، اس کا کتب خانہ اس دور کے نادر اور بیش قیمت کتب خانوں میں تھا، اس کی نگرانی اور انتظام کے لیے پورا عملہ مقرر تھا، نادر اور نایاب کتابوں کی فراہمی کے ساتھ ان کی ظاہری حسن و نفاست میں بھی خانخاناں کو بڑا اہتمام تھا، اور اس کے لیے اس نے اپنے زمانہ کے نامور خطاط، نقاش اور مصور جمع کئے تھے، وہ خود اور اس کے لڑکے مرزا ایرج اور مرزا داراب اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، مولوی غلام محمد ہفت قلم دہلوی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:-

"در خوشنویسی مہارت کمال رسانیدہ و در ہندی خیلے دستگاہ داشت و خط ہندی خوب می نوشت"[2]

ملا عبد الباقی نہاوندی نے مآثر رحیمی میں اس کتب خانے کے ذکر میں اس کے بعض خطاطوں، مصوروں اور نقاشوں کے حالات بھی لکھے ہیں،[3] نامور خطاط یہ تھے:-

ملا عبد الرحیم عنبریں رقم - ان کا نام ابوالفضل کی تحریر میں اوپر آچکا ہے، ان کا وطن ہرات تھا، خانخاناں کے دربار سے متوسل تھے، خط نسخ و نستعلیق دونوں میں کمال رکھتے تھے، ان کے زمانہ میں

---

[1] آئین اکبری ج اول ص ۱۰۶، [2] تذکرۂ خوشنویسان ص ۸۰، [3] مآثر رحیمی کے دوسرے حصہ میں مختلف مقامات پر انکے حالات ہیں۔

عمارتوں اور مسجدوں پر ان کے اشعار کندہ ہیں، فتحپور سیکری کے بلند دروازے اور اسکی جامع مسجد کے کتبات انہی کے لکھے ہوئے ہیں،[1]

خواجہ عبدالصمد شیریں رقم۔ اکبری دور کے عہدہ دار اور نامور خوشنویس و مصور تھے، خط نستعلیق بہت عمدہ لکھتے تھے، ان کا کمال یہ تھا کہ خشخاش کے دانے پر سورۂ اخلاص لکھ دیتے تھے،[2] مصوری میں استاد کا درجہ حاصل کیا،[3] اکبرنامہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف اوقات میں فتحپور سیکری کی ٹکسال کے امین اور صوبہ ملتان کے دیوان رہے۔[4]

میر محمد اصغر الملقب بہ اشرف خاں۔ عرب شاہی سادات میں تھے، ساتوں قلموں کے ماہر تھے، اس لیے ہفت قلم کہلاتے تھے،[5] اکبر کے میر منشی تھے، ان کے حالات ماثر الامراء وغیرہ میں بھی ہیں،[6]

ملا عبدالقادر اخوند۔ اکبر کے استاد تھے، عربی و فارسی زبان اور ان کے علوم میں کمال رکھتے تھے، خوشنویس بھی تھے، آخر عمر میں ہجرت کرکے بیت اللہ چلے گئے تھے،[7]

محمد حسین کشمیری۔ الملقب بہ زریں رقم اکبری دور کے سب سے بڑے خوشنویس تھے۔ ان کے بارہ میں ابوالفضل کا بیان اوپر گذر چکا ہے کہ "اس فن کے ماہران کو ایران کے مشہور کاتب میر علی ہروی کا ہم پایہ سمجھتے تھے"[8] مولوی غلام محمد ہفت قلم لکھتے ہیں کہ "نستعلیق کے ہندوستان کے نامور خوشنویس تھے، اور اس میں اس زمانہ کے تمام خطاط ان کو استاد مانتے تھے، اکبر نے انکو زریں رقم کے لقب سے نوازا تھا،[9]

میر عبداللہ۔ شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد میں تھے، اکبری دور کے نامور خوشنویس تھے، اکبر نے ان کو مشکیں رقم کے لقب سے سرفراز کیا تھا، صاحب دیوان شاعر تھے، وصفی تخلص تھا،[10] ملا عبدالقادر

---

[1] ماثر الامراء ج ۳ ص ۲۶۳ تا ۳۲۰ [2] تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۸ [3] آئین اکبری ص ۷۷، [4] اکبرنامہ حالات ۲۲ و ۱۳ جلوس اکبری [5] تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۶ [6] ملاحظہ ہو ماثر الامراء ج اول ص ۹۹ [7] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۱۔ [8] آئین اکبری ص ۷۷، [9] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۰، [10] ایضاً ص ۹۰،

محمد حسین کشمیری کے سوا اس کا کوئی ہم سر نہ تھا۔

شجاع۔ ان کا اصل وطن شیراز تھا، خانخانان کی سرکار سے متوسل تھے، خط نسخ و نستعلیق کے ماہر تھے، ابتدا میں ان کا تقرر خطاط کی حیثیت سے ہوا تھا، پھر ترقی کرکے کتبخانے کے عہدہ دار مقرر ہوگئے تھے،[1]

بہبود مرزا۔ مشہور خوشنویس تھے، اور نقاشی میں بھی کمال رکھتے تھے۔

ان کے علاوہ اور بھی خوشنویس، نقاش اور مصور تھے، ان کا ذکر ماثر رحیمی میں ہے،

مرزا فتح اللہ شیرازی۔ اکبری دور کے مشہور عالم اور جلیل القدر فاضل تھے، جملہ علوم وفنون میں کمال رکھتے تھے، بعض علوم میں یگانۂ عصر تھے، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس اور خطاط بھی تھے، ان کے حالات اور کمالات کی تفصیل تیموری عہد کی تمام تاریخوں میں ہے، مولوی غلام محمد ہفت قلم دہلوی نے بھی تذکرۂ خوشنویساں میں ان کا مختصر حال لکھا ہے،[2]

زین خان کوکہ۔ اکبری دور کا پنجہزاری امیر تھا، خطاطی اور مصوری میں کمال رکھتا تھا، ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی زمرۂ شعرا میں ان کا مختصر حال لکھا ہے۔[3]

میر معصوم بھکری قندھاری۔ ترمذ کے سادات میں تھے، ان کے والد سید صفائی نے ترک وطن کرکے بھکر (سندھ) میں سکونت اختیار کرلی تھی، میر معصوم کی پیدائش اور تعلیم و تربیت وہیں ہوئی، علوم ظاہری و باطنی دونوں میں کمال حاصل تھا، اکبری دور میں اس کی جانب سے سکھر کی امین الملکی اور اس کی حجامت کے معزز عہدوں پر ممتاز اور ایک ہزاری منصب سے سرفراز ہوئے، خوشگو شاعر اور اہل قلم مصنف بھی تھے، فارسی کا ایک دیوان، مثنوی معدن الافکار اور تاریخ سندھ ان کی علمی یادگار ہیں، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے، ہندوستان، تبریز اور اصفہان کے درمیان بہت سی

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۵ [2] ایضاً ص ۸۹ [3] منتخب التواریخ بدایونی ج ۳ ص ۳۱۰،

بدایونی نے زمرۂ شعرا میں ان کے حالات لکھے ہیں، ان کے خط کے بارہ میں لکھتے ہیں:-

"بسیار خوش خط است شاگرد شاہ غیاث مولانا رقمی است و بہ ہفت قلم می نویسد"[۱]

ملا علی احمد مہرکن - عہد اکبری کے مشہور مہرکن اور اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے، تمام مروجہ خطوں میں ان کو کمال حاصل تھا، مولوی غلام محمد ہفت قلم آئین اکبری کے حوالے سے لکھتے ہیں:-

"فولاد راکسے برابر مولانا علی احمد دہلوی نیاراست خط شناسان او را دریں صنعت بے ہمتائے روزگار دانند، غیر از تعلیق خطوط را بوالا پائیگی رسانید لیکن نستعلیق را بس دلفریب آراید"[۲]

خواجہ حسین احمد چشتی - یہ حضرت شیخ سلیم چشتی کے خلیفہ اور خط نسخ کے استاد تھے، فتحپور سیکری کے بلند دروازے کا بیرونی جو کتبہ ہے وہ انہی کا لکھا ہوا ہے[۳]۔

جہانگیر بھی خوشخطی کا قدردان تھا، اس نے اپنے سب لڑکوں کو اس کی تعلیم دلائی تھی، چنانچہ شاہجہاں نہ صرف خوشنویس بلکہ اس فن کا بڑا نقاد بھی تھا، اس کے دونوں بھائی خسرو اور پرویز اعلیٰ درجہ کے خطاط تھے، مولوی غلام دہلوی ہفت قلم لکھتے ہیں:-

"شاہزادہ خسرو در فن خوشخطی و انشاء کمال داشت سلطان پرویز در علم عربی و فارسی و نوشتن خطوط بنہایت آراستہ و پیراستہ بود، اکثر اوقات او بکتابت کلام اللہ صرف نمود"[۴]۔

جہانگیر کے زمانہ میں بیشتر خطاط وہی تھے جو اکبر کے زمانہ میں تھے، ان کے علاوہ جن خطاطوں نے اس کے زمانہ میں نام پیدا کیا، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:-

محمد شریف شیریں رقم - یہ اکبری دور کے مشہور خطاط خواجہ عبدالصمد کا لڑکا اور جہانگیری دور کا امیر الامراء تھا، اس نے خطاطی اور مصوری باپ سے ترکہ میں پائی تھی، اس کا کمال یہ تھا کہ چاول

۱؎ تاریخ بدایونی ج ۳ ص ۲۰۲ ۲؎ تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۹ ۳؎ بزم تیموریہ ص ۴؎ تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۱

کے دانے پر خدم و حشم کے جملہ لوازم کے ساتھ مسلح سوار کی تصویر بنا دیتا تھا، اس نے اکبر اور جہانگیر دونوں کا زمانہ پایا، لیکن اکبر کی زندگی ہی میں شاہزادے جہانگیر کی سرکار سے متوسل ہوگیا تھا، جہانگیر نے اس کو اپنے زمانہ میں امیر الامراء کے خطاب سے نوازا، شاعر بھی تھا، مآثر الامراء اور بدایونی وغیرہ میں بھی اس کا حال ہے۔

قاضی احمد غفاری - عہد جہانگیری کا مشہور خوشنویس تھا، نستعلیق میں خاص طور سے مہارت تھی، شاہزادے خسرو کو اسی نے خوشخطی کی تعلیم دی تھی، اس کی وفات کے بعد ملازمت چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کرلی تھی، بدایونی نے بھی شعراء کے زمرہ میں اس کا حال لکھا ہے[۱]۔

مرزا محمد حسین - مصنف حبیب السیر غیاث الدین بن ہمام الدین المعروف بہ خوندمیر کا عزیز تھا، ہمایوں کے زمانہ میں ہندوستان آیا تھا، اس نے اور اس کے بعد اکبر نے اس کی بڑی قدردانی کی، خط تعلیق، نستعلیق، ثلث اور شکستہ چاروں کا بڑا ماہر تھا، اس سے پہلے خط شکستہ کے کوئی اصول و قواعد نہ تھے، اور اس کا شمار کسی خط میں نہ تھا، مرزا محمد حسین نے اس کے اصول و ضوابط مقرر کرکے اس کو ایک مستقل خط کی حیثیت دیدی، اس حیثیت سے وہ گویا اس خط کا موجد ہے، جہانگیر کے زمانہ میں ۱۰۰۶ھ میں انتقال کیا[۲]۔

احمد علی ارشد - اکبری اور جہانگیری عہد کا مشہور طغرا نویس تھا، فتحپور سیکری کے بلند دروازے پر اس کا لکھا ہوا طغرا ہے، جس میں خلفائے راشدین اور پنجتن پاک کے نام درج ہیں[۳]۔

تیموری سلاطین میں فنون لطیفہ کا سب سے بڑا سرپرست اور قدردان شاہجہاں تھا، اس لیے وہ خطاطی کا بھی قدردان تھا، خود بھی نستعلیق کا ماہر تھا، اور اس نے اپنے سب لڑکوں کو خوشخطی کی تعلیم دلائی تھی، وہ مشہور خوشنویسوں کی خطاطی کے نمونوں کا اتنا شائق تھا کہ جو شخص میر عماد تبریزی کی

۱؎ منتخب التواریخ بدایونی ج ۳ ص ۳۱۰ ۲؎ تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۰ ۳؎ ایضاً ۴؎ تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۴

کی تحریر کا ہدیہ اس کی خدمت میں پیش کرتا تھا اس کو اس کے معاوضہ میں یک صدی منصب عطا کرتا تھا۔[1]

اس کی اس قدر دانی سے اس کے عہد میں خوشخطی نے اور زیادہ ترقی کی اور اس کے بڑے بڑے کاتب پیدا ہوئے، مولوی غلام محمد دہلوی لکھتے ہیں:۔

"شاہزادہ خرم یعنی شاہ جہاں بادشاہ در تحصیل علم عربی و فارسی و خط نستعلیق نہایت مہارت داشتند......... در آں عصر از خوشنویساں ملا باقر کشمیری، محمد حسین کشمیری و مقصود علی و میر محمد کاشی و حافظ عبد اللہ و شکر اللہ و محمد تقیم درخط نستعلیق و شکستہ کوس کتابت می نواختند و مرزایان دفتر بودند۔"

ان خطاطوں اور بعض دوسرے مشہور خوشنویسوں کا مختصر تعارف یہ ہے:۔

آقا عبد الرشید دیلمی۔ شاہ جہانی عہد کا سب سے بڑا اور باکمال خوشنویس تھا، وہ ایران کے مشہور خطاط میر عماد کا بھانجا اور شاگرد اور اپنے دور کا یگانۂ روزگار خطاط تھا، مولوی غلام محمد ہفت قلم لکھتے ہیں کہ "وہ ملک خطاطی کا پیغمبر تھا، گذشتہ تمام خطاطوں پر گوئے سبقت لے گیا، اس کے بعد اس کا کوئی ہم سر نہیں پیدا ہوا، اور یہ فن اس پر ختم ہو گیا، شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا اور شاہزادہ دارا شکوہ کی استادی پر مامور ہوا، بیوتات اکبر آباد کا عہدہ بھی اس کے سپرد تھا، یہاں اس نے بہت سی عمارتیں اور سرائیں وغیرہ بنوائیں، اور مرنے کے بعد یہیں دفن ہوا دارا شکوہ کے علاوہ محمد اشرف خواجہ سرا، سعیدائے اشرف، عبد الرحمٰن وغیرہ اس کے ارشد تلامذہ میں تھے[2]، آقا عبد الرشید دیلمی نستعلیق میں ایک خاص دلکش طرز کا موجد تھا، جو اسقدر مقبول ہوا کہ ہندوستان کے اکثر خوشنویسوں نے اس کی تقلید کی اور یہ خط پورے ملک میں پھیل گیا۔

---

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۳ [2] ایضاً ص ۵۵

عبد الباقی حداد المخاطب یاقوت رقم خان۔ اس کا وطن بھی ایران تھا، شاہجہاں کے زمانہ میں ہندوستان آیا، یہ بھی بڑا باکمال خوشنویس خصوصاً خط نسخ کا بڑا ماہر تھا، اس خط کو اپنی جدت طرازی اور حسن مذاق سے عروس الخطوط بنا دیا تھا، اور اس میں اس کا کوئی ہم سر نہ تھا، اورنگزیب کی شاہزادگی کے زمانہ میں کلام مجید کے نسخے لکھکر اس کی خدمت میں پیش کیے، جس میں ایک نسخہ کل تیس اوراق میں تھا، اورنگ زیب نے اس کے صلہ میں یاقوت رقم خاں کے لقب سے سرفراز کیا، مگر اس نے ہندوستان میں قیام نہیں کیا، اور اپنے چند نامور شاگردوں کو چھوڑ کر ایران لوٹ گیا، اس کے اکثر شاگرد یاقوت رقم کے لقب سے ملقب ہوئے۔ (تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۲۵)

مرزا جعفر المخاطب بہ کفایت خاں۔ عہد شاہجہانی کا امیر اور نامور خطاط تھا، ابتدا میں مجالسی اور منقح نویسی کی خدمت پر مامور ہوا، پھر شاہجہاں کی نظر توجہ سے "دیوانی تن و خالصہ شریفہ" کے معزز عہدہ تک ترقی کی اور کفایت خاں کے لقب سے ملقب ہوا، خوشنویس بھی تھا خصوصاً شکستہ کا بڑا ماہر تھا، اور اپنے حسن مذاق سے تعلیق اور شکستہ میں نیا طرز اور آب و رنگ پیدا کیا جس میں کوئی دوسرا خوشنویس اس کا ہم سر نہ تھا، اورنگزیب کے عہد ۱۰۹۵ھ میں انتقال کیا۔ اس کا ذکر مآثر الامرا میں بھی ہے۔

مرزا عبد اللہ خاں المخاطب بہ درایت خاں۔ یہ کفایت خاں کا بھائی اور دربار شاہی سے درایت خاں کے لقب سے ملقب تھا، یہ بھی خط تعلیق اور شکستہ کا ماہر تھا، اور ان دونوں خطوں میں اپنے بھائی سے بھی بازی لے گیا تھا، اور خط شکستہ میں ایسا حسن پیدا کر دیا تھا کہ اس کو خط نستعلیق کا ہم پایہ بنا دیا تھا، مولوی غلام محمد لکھتے ہیں کہ "اس ایجاد میں اس نے سحر سامری سے کام لیا تھا، اگر ملا میر علی اس کے خط شکست کو دیکھتے تو نستعلیق سے دست کش ہو جاتے۔ یہ خط کیا تھا گل و ریحان و باغ و بہار تھا، اس کا جیسا جلی و خفی خط شکستہ دیکھنے میں نہیں آیا، اس کا دوسرا بھائی محمد اکبر خاں بھی خوشنویس تھا۔

میر مراد کشمیری، المخاطب بہ شیریں قلم۔ عہد شاہجہانی کا سحر طراز اور جادو رقم خوشنویس تھا،
اس کی تازہ نگاری نے دوسرے خوشنویسوں کی خطاطی پر خط نسخ پھیر دیا تھا، مولوی غلام محمد نے
اس کی تعریف و توصیف میں بڑی شاعری سے کام لیا ہے۔

میر محمد صالح و میر محمد مومن۔ اکبری دور کے خوشنویس میر عبد اللہ مشکین قلم کے لڑکے
اور اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، مولوی غلام محمد ہفت قلم ان کو سحر رقم لکھتے ہیں، شاعر بھی تھے، فارسی
اور ہندی دونوں میں کہتے تھے، میر محمد صالح کا فارسی میں کشفی اور ہندی میں سبحانی تخلص تھا،
میر مومن کا تخلص عرشی تھا، یہ دونوں ہندی کے ایسے باکمال شاعر تھے کہ ان کے سامنے ہندستانی
شعراء کان پکڑتے تھے، (تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۰۱ و ۱۰۲)

اورنگزیب فنون لطیفہ کا زیادہ قدر دان نہ تھا، لیکن خوشنویسی سے اس کو بھی ذوق تھا، وہ خود اعلیٰ
درجہ کا خوش نویس تھا، اس کے لکھے ہوئے کلام مجید آج بھی اس کی خوشنویسی کے شاہد ہیں، اس لیے اس کے
زمانہ میں بھی بڑے بڑے خوشنویس پیدا ہوئے، ان میں اکثروں نے شاہ جہاں اور اورنگزیب دونوں
کا زمانہ پایا، بلکہ بعض بہادر شاہ اول کے زمانہ تک زندہ رہے، اس لیے ان کا شمار تینوں زمانوں
میں ہوسکتا ہے، عمر کا زیادہ حصہ جس کے زمانہ میں گذرا اس کے زمانہ میں اس کا شمار کیا گیا ہے، اس
لحاظ سے اورنگ زیب کے زمانہ میں حسب ذیل مشہور خوشنویس تھے :-

سید علی خاں جواہر رقم۔ اصل وطن تبریز تھا، اس کو خطاطی سے فطری ذوق تھا، اور بڑے
ریاض سے اس فن کو حاصل کیا تھا، میر عماد اور خواجہ عبد الرشید دیلمی دونوں کے طرز کا ماہر تھا، آقا عبد الرشید
دیلمی سے اس کو بڑی عقیدت تھی اور وہ بھی اسکو بہت مانتے تھے، اورنگ زیب کے ابتدائی دور میں ہندستان
آیا، اس کو اس نے شاہزادوں کی تعلیم پر مامور کیا، پھر ترقی کر کے کتب خانۂ شاہی کی داروغگی کے منصب
فائز ہوا، اس کی عمر کا بڑا حصہ اورنگ زیب کے ساتھ کشمیر اور دکن میں بسر ہوا، اور دکن ہی میں

اس کا انتقال ہوا، ایک روایت یہ بھی ہے کہ شاہ جہاں کے زمانہ میں ہندستان آیا تھا، اس نے اسکو
اورنگ زیب کی تعلیم پر مامور کیا تھا، پھر اورنگ زیب نے اس کو اپنے زمانہ میں کتب خانہ کی داروغگی
پر مامور اور جواہر رقم کے لقب سے سرفراز کیا، (تذکرہ خوشنویساں ص ۵۷)

ہدایت اللہ خاں زریں رقم۔ سید علی خاں کا شاگرد رشید اور خوشنویسی میں استاد وقت تھا،
اور اس فن میں استاد سے بھی سبقت لے گیا تھا، اورنگ زیب نے اس کو بھی شاہزادوں کی استادی
پر مقرر کیا تھا، مرزا کام بخش اور محمد اعظم شاہ کے لڑکے اس کے شاگرد اور بہت اچھے خوشنویس تھے، آخر میں
یہ بھی کتب خانہ کی داروغگی پر مامور اور زریں رقم کے لقب سے ملقب ہوا، اس نے اورنگ زیب کے لیے
دیوان حافظ کے کئی نسخے لکھے تھے۔ (تذکرۂ خوشنویساں ص ۸۵)

میر محمد باقر۔ اورنگ زیب کا درباری خوشنویس تھا، اس کو محمد باقر کا خط بہت پسند تھا، اپنے
اکثر خطوط میں اس کا ذکر کیا ہے، شاہزادہ والاجاہ وغیرہ کی تعلیم بھی اس کے سپرد تھی،

میر محمد زاہد۔ اورنگ زیب کے آخری عہد کا باکمال خوشنویس تھا، مصوری میں بھی دستگاہ
رکھتا تھا، اورنگ زیب کے بعد تیموری حکومت پر زوال آگیا، شاہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہوگئی،
صوبے آزاد ہونے لگے اور حکومت کا سارا نظام درہم برہم ہوگیا، آئے دن حکومت بدلتی تھی، ایک دو
بادشاہوں کے علاوہ کسی بادشاہ کو چند برسوں سے زیادہ حکومت کا موقع نہیں ملا، ایسی حالت میں
الگ الگ ہر عہد کے کاتبوں کا حال لکھنا دشوار ہے۔ جہاں تک ممکن ہوگا ان کے زمانہ کے تعین
کی کوشش کی جائے گی۔

مرزا حاتم بیگ۔ شاہ عالم بہادر شاہ اول کے زمانہ کا مشہور خوشنویس تھا، خصوصاً خط
شکستہ کا بڑا ماہر اور شاعر و انشاء پرداز بھی تھا، اور شاہی دربار میں میر منشی کے عہدے پر سرفراز تھا،

محمد عارف۔ عالمگیری عہد کے مشہور ایرانی خوشنویس عبد الباقی حداد کا شاگرد اور اپنے

دور کا نامور خوشنویس تھا، خط نسخ و ثلث میں کمال رکھتا تھا، نسخ میں ایک خاص طرز ایجاد کیا تھا، بہادر شاہ اول کے دربار سے متوسل اور یاقوت رقم کے خطاب سے سرفراز تھا، اس کے شاگردوں میں محمد افضل، محمد عسکری، مرزا افضل اللہ اور زین العابدین وغیرہ استاد کے طرز میں خاص کمال رکھتے تھے۔

حاجی نامدار۔ فرخ سیر کے زمانہ کا مشہور خوشنویس تھا، آقا عبدالرشید کے طرز میں خط خفی بہت اچھا لکھتا تھا، اس کے زمانہ کے اکثر شاہزادے خوشنویسی میں اس کے شاگرد تھے۔

دور زوال کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ طویل عہد حکومت محمد شاہ کا تھا، اور وہ خوشنویسوں کا قدردان بھی تھا، اس لیے اس کے زمانہ میں بڑے بڑے خوشنویس ہوئے، ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:

محمد حفیظ خاں۔ محمد شاہی عہد کا بے نظیر استاد تھا، خط نسخ، ثلث، تعلیق اور شکستہ وغیرہ میں کمال رکھتا تھا، دربار شاہی سے یساولان کی داروغگی" کے منصب پر فائز تھا، کئی کلام مجید لکھکر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیے، ان کے فیض تعلیم سے اس کے شاگردوں میں بڑے بڑے خوشنویس پیدا ہوئے، نستعلیق میں میر ابوالحسن عرف میر کلن، قادر بخش، محمد اسمٰعیل، محمد تقی، اور خط شکست میں منشی لچھمن سنگھ، بچھمی رام پنڈت، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ وغیرہ اپنے دور کے نامور استاد تھے، مولوی غلام محمد دہلوی ہفت قلم بھی انہی کے شاگرد تھے۔ (تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۱ و ۱۱۲)

محمد افضل لاہوری۔ یہ بھی محمد شاہی دور کا نامور خوشنویس تھا، اور آقائے ثانی کے لقب سے مشہور تھا۔

محمد افضل حسینی۔ اس دور کا نامور خوشنویس تھا، محمد شاہ کے وزیر اعتماد الدولہ نواب قمر الدین کی سرکار سے متوسل تھا۔

میر محمد موسیٰ۔ سرہند کے عالی نسب سادات میں تھے، میر عماد کے طرز میں بہت عمدہ لکھتے تھے، محمد شاہ کی سرکار میں خوشنویسوں کے زمرہ میں منسلک تھے۔

نواب مرید خاں محمد صادق طباطبائی۔ عالی خاندان سادات اور محمد شاہی دور کے امراء میں تھے، خط شکستہ، تعلیق اور ثلث میں کمال رکھتے اور ان کو بڑی ترقی دی تھی، خط شکست کئی طرز سے لکھتے تھے، خط ریحان و ثلث میں کلام مجید کے کئی نسخے اور خط تعلیق و شکستہ میں گلستان مطلاً و مذہب ان کی یادگار تھے۔

نواب منظر خاں۔ محمد شاہی امیر روشن الدولہ مظفر خاں کے لڑکے تھے، خط شکست میں نواب مرید خاں کے ہم پایہ مانے جاتے تھے۔

قاضی عصمت اللہ خاں۔ شاہ عالم ثانی کے دور کے خوشنویس تھے، اور خط نسخ میں تمام خطاطوں پر گوئے سبقت لے گئے تھے، اور اس میں بڑی خوبصورت ایجادیں کی تھیں، انھوں نے کلام اللہ، حمائل اور قطعات وغیرہ بکثرت لکھے، ۱۱۸۶ھ میں انتقال کیا، ان کے بھائی فیض اللہ خاں بھی نامور خوشنویس تھے، انھوں نے بھی کلام مجید کے نسخے یادگار چھوڑے، فیض اللہ خاں کے لڑکے عباد اللہ خاں بھی خوشنویسی میں باپ کے خلف الصدق تھے، اور ان کے لکھے ہوئے کلام مجید کے ناتمام نسخوں کو مکمل کیا اور ان کے خط سے اپنا خط ایسا ملا دیا تھا کہ بڑے بڑے مبصر دونوں میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔

حافظ محمد علی۔ قدیم شاہی خوشنویس تھے، خط نسخ کے ماہر اور نستعلیق آقا عبدالرشید دیلمی کے طرز میں بہت اچھا لکھتے تھے، شاہ عالم کے لڑکے مرزا جواں بخت بہادر کے استاد تھے، ان کے لڑکے بقا اللہ بھی خوشنویسی میں باپ کے خلف الصدق تھے، اور اپنی آبائی خدمت شاہزادوں کی استادی پر مامور تھے۔

میر ابوالحسن عرف کلن۔ عالی خاندان سادات رضوی میں تھے، خط نسخ و نستعلیق میں محمد حفیظ خاں کے شاگرد اور آقا عبدالرشید کے طرز میں بہت عمدہ لکھتے تھے، ایک زمانہ تک نواب عبدالاحد خاں کی رفاقت میں رہے، پھر اکبر شاہ ثانی کی سرکار سے متوسل ہو گئے تھے، ان کے لڑکے میر محمد حسین بھی خوشنویسی میں باپ کے

صحیح جانشین اور لکھنؤ میں مرزا سلیمان شکوہ کے میر منشی تھے،

غلام علی خاں۔ یہ خوشنویس ہی کے نام سے مشہور اور اکبر شاہ ثانی کے خوشنویسوں میں تھے، بڑے لسان، خوش گفتار اور علم مجلسی کے ماہر تھے، اور دوہرہ اور گیت وغیرہ بہت عمدہ پڑھتے تھے،

حافظ ابراہیم۔ یہ بھی اکبر شاہ ثانی کے درباری خوشنویس اور شاہزادوں کے استاد تھے۔

میر زین العابدین۔ عالی نسب سید شاہ اعزالدین کے شاگرد، طغرانویسی کے ماہر اور اکبر شاہ ثانی کے ملازم تھے،

مولانا صاحب۔ خط نستعلیق کے مشہور استاد تھے، آقا عبدالرشید کے طرز میں ایسا کمال بہم پہنچایا تھا کہ نقل کو اصل کے مطابق بنا دیا تھا، اکبر شاہ ثانی کے لڑکے مرزا معظم بخت بہادر کے استاد اور آقا آقائی کے خطاب سے سرفراز تھے،

مولوی غلام محمد دہلوی ہفت قلم دہلوی، اکبر شاہ ثانی کے زمانہ کے نامور خطاط اور مشہور خوشنویس تھے، خط نسخ، نستعلیق، ثلث، شکستہ، ریحان، اور شفیعہ ساتوں خطوں میں کمال حاصل کیا تھا، اس لیے ہفت قلم کہلاتے تھے، فارسی کے اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے، شاعر بھی تھے، اردو، فارسی دونوں میں داد سخنوری دیتے تھے، فن خوشنویسی کے سلسلہ میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے خوشنویسوں کا ایک مستقل تذکرہ لکھ کر ان کی تاریخ محفوظ کر دی، انھوں نے اس کتاب میں زیادہ تر انہی خوشنویسوں کے حالات لکھے ہیں جن کی قلمکاری کے نمونے انھوں نے خود دیکھے ہیں، اور اپنے زمانہ کے اکثر خوشنویسوں سے ملے ہیں اور ان سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے، یہ تذکرہ عرصہ ہوا ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ سے چھپ چکا ہے، اور خوشنویسوں کے حالات کا سب سے بڑا ماخذ ہے، اس مضمون میں بھی زیادہ تر اسی سے استفادہ کیا گیا ہے، آخری عمر میں لکھنؤ چلے آئے تھے، اور یہیں ۱۲۳۹ھ میں انتقال ہوا،

میر مہدی۔ یہ خاندانی خوشنویس تھے، کئی پشتوں سے ان کے خاندان میں خوشنویسی چلی آرہی تھی،

طغرانویسی میں خصوصیت کے ساتھ کمال حاصل تھا، اس میں بڑی باریکیاں پیدا کی تھیں، نواب حکیم حسام الدین حیدر خاں کی سرکار میں محرری خطاطی کے صیغہ میں ملازم تھے۔

نواب عماد الملک غازی الدین خاں۔ احمد شاہ بن محمد شاہ اور اس کے بعد عالمگیر ثانی کے وزیر ہوئے، عربی و فارسی کے جید فاضل، شعر و ادب کے ماہر اور صاحب دیوان شاعر تھے، نظام تخلص کرتے تھے، اعلیٰ درجہ کے خطاط اور ہفت قلم تھے، خصوصاً نسخ، نستعلیق اور شکستہ بہت عمدہ لکھتے تھے، عالمگیر ثانی کے بعد خانہ نشین ہوگئے تھے،

مرزا ارجمند۔ نواب عماد الملک کے میر منشی تھے، انشا، شاعری، خوشنویسی اور مصوری وغیرہ میں کمال رکھتے تھے، خط شفیعہ مختلف طریقوں سے لکھتے تھے،

سید محمد امیر رضوی پنجہ کش۔ دلی کے عالی خاندان سادات میں تھے، اور اپنے دور کے بینظیر خوشنویس تھے، پنجہ کشی، مصوری، نقاشی، لوح، جدول، صحافی، علاقہ بندی اور سنگتراشی مختلف فنون وصنائع میں کمال رکھتے تھے، آقا عبدالرشید کے طرز میں ایسا لکھتے تھے کہ دونوں کے خط میں امتیاز کرنا مشکل تھا، چنانچہ ان کی لکھی ہوئی تحریریں، آقا عبدالرشید کے نام سے گراں قیمت پر فروخت ہوتی تھیں، انھوں نے آقا عبدالرشید کا عرس بھی قائم کیا تھا جس میں دلی کے تمام خوشنویس جمع ہو کر اس فن پر بحث و گفتگو کرتے تھے، ان کے تلامذہ کا دائرہ بہت وسیع تھا، مولوی غلام محمد دہلوی کے ہم عصر تھے، انکے حالات سرسید نے بھی آثار الصنادید میں لکھے ہیں،

مرزا عباد اللہ بیگ۔ میر پنجہ کش کے شاگرد رشید اور نستعلیق کے مسلم الثبوت استاد تھے، میر صاحب اپنے تمام شاگردوں میں اس کو بہت مانتے تھے، شاہی خوشنویسوں کے زمرہ میں شامل اور زمرد رقم کے خطاب سے سرفراز تھے،

آغا مرزا۔ یہ بھی میر پنجہ کش کے نامور شاگرد تھے، اور استاد کے طرز میں اتنا کمال بہم پہنچایا تھا کہ

ان کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے،

اخوند عبدالرسول قندھاری۔ ان کا وطن قندھار تھا، دلی میں سکونت اختیار کر لی تھی، خط نستعلیق کے استاد سمجھے جاتے تھے،

امام الدین احمد خاں نواب دبیر الدولہ خواجہ زین العابدین مصلح جنگ کے فرزند ارجمند اور خوشنویسی میں میر پنجہ کش اور اخوند عبدالرسول کے شاگرد اور اپنے زمانہ کے نامور خوشنویس تھے،

میر امام الدین۔ خط نسخ کے ماہر اور ابوظفر بہادر شاہ کے استاد تھے، ان کے زمانہ میں ان سے بہتر خط نسخ لکھنے والا نہ تھا،[1]

ان کے علاوہ سر سید نے اس دور کے خوشنویسوں میں حافظ کلو خاں، مولوی حیات علی، بدرالدین علی خاں مہرکن وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے،

بہادر شاہ ظفر۔ آخری تیموری بادشاہ بہادر شاہ ظفر بھی اعلیٰ درجہ کے خوشنویس تھے، انکی لکھی ہوئی وصلیاں آج بھی موجود اور ان کے کمال فن کی شاہد ہیں،

لکھنؤ کے خوشنویس

دلی کا دربار اجڑنے کے بعد یہاں کے اہل کمال لکھنؤ میں جمع ہو گئے تھے، اور خود لکھنؤ میں بھی اعلیٰ درجے کے خوشنویس پیدا ہوئے، ان کا سلسلہ شجاع الدولہ کے عہد سے شروع ہو گیا تھا، ان میں سے بعض کے نام یہ ہیں:-

نواب تفضل حسین خاں۔ صاحب علم واستعداد تھے، عربی، فارسی زبان اور منطق وریاضی وغیرہ کے فنون میں کمال حاصل تھا، خط تعلیق اور شکست بہت اچھا لکھتے تھے، ابتدا میں بارہہ کے سید زادوں کے اتالیق تھے، نواب شجاع الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے اور ان کے لڑکے سعادت علی خاں کے اتالیق مقرر ہوئے، انگریزوں کے فراج میں اس کو بڑا رسوخ حاصل تھا، چنانچہ

[1] ان سب کے حالات تذکرہ خوشنویساں اور بعض کے آثار الصنادید سے ماخوذ ہیں۔

ان کی سفارش پر لکھنؤ کی نظامت اور آصف الدولہ کی نیابت کے عہدے پر مامور ہو گئے، پھر سعادت علی خاں کے زمانہ میں ان کے وکیل کی حیثیت سے کلکتہ میں ان کا تقرر ہو گیا،

میر عطا حسین تحسین۔ مشہور قصہ چہار درویش کے مصنف، اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے، خط نسخ نستعلیق اور شفیعہ تینوں کے ماہر تھے، نواب شجاع الدولہ کے دربار سے متوسل تھے، انہی کی فرمائش سے قصہ چہار درویش لکھی تھی،

مرزا احمد طباطبائی۔ نواب مرید خاں کی اولاد میں تھے اور خط نسخ و شکست اپنے موروثی طرز پر بہت اچھا لکھتے، فیض آباد میں قیام تھا،

حافظ نوراللہ۔ ان کا اصل وطن دہلی تھا، نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے اور دربار آصفی سے متوسل ہو گئے، اپنے دور کے بڑے باکمال خوشنویس تھے، آقا عبدالرشید کے طرز میں ان کر بہتر لکھنے والا نہ تھا، نواب آصف الدولہ کی فرمائش پر ان کے لیے ہفت بند کاشی لکھی، مولوی غلام محمد ہفت قلم کا بیان ہے کہ اس میں ایسی سحر کاری تھی کہ اس کے دیکھنے سے دل سیر نہ ہوتا تھا، انکے شاگردوں میں لالہ سرب سنگھ اور میاں وجہ اللہ مشہور خوشنویس تھے،[1] ان کے بھائی حافظ خورشید بھی نستعلیق کے بہت اچھے خطاط تھے، مولوی عبدالحلیم شرر مرحوم نے ان کو آقا عبدالرشید دیلمی کا شاگرد لکھا ہے جو صحیح نہیں ہے، عبدالرشید دیلمی کا انتقال ۱۰۸۱ھ میں ہوا ہے، اور نوراللہ آصفی عہد (۱۱۸۸ھ۔۱۲۱۲ھ) میں تھے، دونوں کے زمانوں میں ایک صدی سے زیادہ کا فرق ہے، لکھنؤ میں نوراللہ کی اتنی قدردانی ہوئی کہ ان کے ہاتھ کے لکھے قطعے موتیوں کے داموں فروخت ہوتے تھے، انکی معمولی مشق بازار میں ایک روپے حرف کے حساب سے فروخت ہوتی تھی،[2]

مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ حافظ نوراللہ کے شاگردوں میں زیادہ ممتاز سب سے اول تو خود ان کے

[1] تذکرہ خوشنویساں [2] ہندوستان میں مشرقی تمدن کا آخری نمونہ، ص ۱۱۷

بیٹے ابراہیم تھے، دوسرے منشی سرب سنگھ نام کے ایک ہندو بزرگ تھے جن کو کوئی کایستھ بتاتا ہے، اور کوئی کشمیری پنڈت، تیسرے محمد عباس نام لکھنؤ کے ایک خوشنویس تھے، حافظ ابراہیم نے بھی بڑا نام پیدا کیا، سیکڑوں آدمیوں کو خوشنویس بنادیا اور فن میں مجتہدانہ مرتبہ پیدا کرکے اپنے والد سے جدا ایک شان پیدا کی..... حافظ ابراہیم کے ممتاز شاگردوں میں ان کے لڑکے سعید الدین، منشی نظیر حمید، منشی عبدالمجید، منشی ہادی علی اور منشی منسارام کشمیری پنڈت تھے۔ منشی عبدالمجید شاہی احکام و فرامین نگاری کے منصب پر مامور رہے، منشی ہادی علی اور منشی منسارام سارے لکھنؤ کے استاد مانے جاتے تھے، منشی ہادی علی نستعلیق کے علاوہ نسخ اور طغرا نویسی میں بھی اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔[1]

مرزا محمد علی۔ مرزا خیراللہ فرمان نویس کے لڑکے، اپنے دور کے خطاطی کے مسلم الثبوت استاد اور خفی و جلی دونوں میں جادو رقم تھے، آقا عبدالرشید دیلمی کے طرز میں یگانہ و یکتا مانے جاتے تھے، ابتدا میں نواب عمادالملک کے یہاں ملازم تھے، پھر فرخ آباد میں قیام کیا، آخر میں آصفی عہد میں لکھنؤ چلے آئے تھے، اور مرزا وزیر علی کی استادی پر مامور ہوئے، اور ان کے لیے پندنامہ اور گلستاں لکھی اور اس میں اپنے فن کا پورا کمال صرف کردیا، ان کے شاگردوں میں قاضی نعمت اللہ، خلیفہ بخش اللہ اور میر نثار علی مشہور خوشنویس ہوئے۔[2]

قاضی نعمت اللہ۔ مرزا محمد علی کے تمام شاگردوں میں سب سے زیادہ ناموری قاضی نعمت اللہ نے حاصل کی، مولوی عبدالحلیم شرر نے ان کو بھی آقا عبدالرشید دیلمی کا شاگرد لکھا ہے، مگر ان کے اور آقا عبدالرشید کے زمانہ میں بھی وہی فرق ہے جو حافظ نوراللہ اور آقا کے زمانہ میں ہے، اس لیے یہ بھی شاگرد نہیں ہو سکتے، مولوی عبدالحلیم شرر کو اس لیے دھوکا ہوا کہ حافظ نوراللہ اور قاضی نعمت اللہ آقا عبدالرشید دیلمی کے طرز کے مقلد تھے، یہ بھی آصف الدولہ کے زمانہ میں لکھنؤ آئے تھے، انھوں نے

[1] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ: ص ۱۱۸ و ۱۱۹ [2] تذکرۂ خوشنویسان ص ۶۷

ان کو شاہزادوں کے خط کی اصلاح کی خدمت پر مامور کیا، اور حافظ نوراللہ کی طرح انھوں نے بھی لکھنؤ میں بڑا نام پیدا کیا، مولوی عبدالحلیم شرر لکھتے ہیں کہ لکھنؤ میں اگرچہ اور بھی پرانے خوشنویس تھے لیکن آقا عبدالرشید کے شاگردوں (اس سے مراد حافظ نوراللہ اور قاضی نعمت اللہ ہیں) نے اپنا ایسا سکہ جمالیا کہ خوشنویسی کے تمام شایق بلکہ سارا شہر اس کی طرف رجوع ہوگیا، جسے خطاطی کا شوق ہوا، انہی کا شاگرد ہوگیا، اور تمام خوشنویسانِ سلف کے نام مٹ کے گمنامی کے ناپیدا کنار سمندر میں غرق ہوگئے اور سچ یہ ہے کہ یہ بزرگ اپنے کمال کے اعتبار سے اس کے مستحق بھی تھے،[1] قاضی نعمت اللہ کے ایک شاگرد ان کے فرزند مولوی محمد اشرف تھے، دوسرے مولوی قل احمد،

آخر زمانہ میں سندیلہ کے ایک منشی عبدالحیٔ بڑے باکمال خوشنویس تھے، جن کے شاگرد منشی امیر اللہ ان کے بڑے بھائی منشی محمد عبداللطیف اور منشی اشرف علی وغیرہ تھے، فی الحال نستعلیق میں منشی شمس الدین صاحب اور نسخ میں منشی حامد علی صاحب کو شہرت ہے، اور یہ دونوں منشی ہادی علی صاحب کے شاگرد ہیں، منشی ہادی علی کے ہم عصر نسخ کے ایک مشہور خوشنویس میر بندہ علی مرتعش تھے، ان کے استاد نواب احمد علی نام ایک پرانے وقت کے رئیس اور نسخ کے باکمال استاد تھے، میر بندہ علی کے ہاتھ میں رعشہ تھا، مگر قلم جیسے ہی کاغذ پر لگتا معلوم ہوتا کہ لوہے کا ہاتھ ہے، کیا مجال کہ قابو سے باہر ہو، ان کی نظر خط پہچاننے میں ایسا کمال رکھتی تھی کہ بڑے بڑے لوگ لوہا مان گئے۔[2]

ہندو خوشنویس جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے، اس زمانہ میں خوشخطی لازمۂ تعلیم و شرافت سمجھی جاتی تھی، اور ہندو بھی تعلیم میں کسی سے پیچھے نہ تھے، سرکاری دفاتر خصوصاً مال اور دیوانی کے شعبہ میں ان کی کثرت تھی اور دفتری کاروبار کے لیے انشا، اور خوشخطی ضروری تھی، اسلئے ہندوؤں میں بہت سے خوشنویس خصوصاً خط نستعلیق اور شکست کے بڑے بڑے ماہر پیدا ہوئے، مولوی غلام محمد نے بہت سے ہندو خوشنویسوں کا حال لکھا ہے، ان میں سے بعض کے نام اوپر گذر چکے ہیں، چند نامور خوشنویسوں کے نام حسب ذیل ہیں:

[1] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ: ص ۱۱۶ [2] ایضاً ص ۱۲۰ و ۱۲۱

راجہ ٹوڈرمل کھتری۔ اکبری دور کے مشہور امیر اور دربار اکبری کے نورتن راجہ ٹوڈرمل خوشنویس بھی تھے، مولوی غلام محمد دہلوی لکھتے ہیں: "نویسندۂ چابک دست و خطوط را بخوشخطی و نکی می نوشت"[1]۔ ان کے حالات مغلوں کی تمام تاریخوں میں ہیں، اور ان کی شہرت تعارف سے مستغنی ہے۔

رائے منوہر لونی کرن توسنی کچھواہا۔ راجہ سانبھر کے لڑکے تھے، اکبر کے دامن تربیت میں پرورش پائی، اور جہانگیر کے دور میں ان کی نشوونما ہوئی[2]، مرزا راجہ خطاب تھا، اکبر ان کو بہت مانتا تھا، فارسی زبان کے ماہر تھے، شاعر بھی تھے، بدایونی نے ان کے اشعار نقل کیے ہیں[3]، خوشنویس بھی تھے، مولوی غلام محمد دہلوی لکھتے ہیں "سلیقہ شاعری و خوشخطی بہم رسانیدہ[4]"۔

چندربھان برہمن۔ عہد شاہجہانی کا مشہور شاعر، ادیب اور اہل قلم تھا، مختلف امرا کی سرکاروں میں ملازم رہا، پھر شاہی دربار سے متوسل ہوگیا، دارا شکوہ کو اس کی انشا بہت پسند تھی، اس لیے اسکی زندگی بھر اس کا میر منشی رہا، اسکی متعدد تصانیف ہیں، ان میں چہار چمن، منشآت برہمن اور دیوان زیادہ مشہور ہیں[5]، اعلیٰ درجہ کا خوشنویس بھی تھا، نستعلیق میں آقا عبدالرشید دیلمی اور شکست میں کفایت خاں کا شاگرد تھا، اور دونوں میں استادی کا درجہ حاصل تھا[6]۔

منشی سج بھان۔ یہ بھی مذکورۂ بالا دونوں اساتذہ کا شاگرد اور نستعلیق و شکست کا ماہر تھا[7]۔

رائے پریم ناتھ کھتری۔ ان کے اسلاف شاہ عالم ثانی کے زمانہ میں "پیشکار تن" کے عہدہ پر سرفراز تھے، رائے پریم ناتھ نواب مرید خاں کے شاگرد اور اپنے زمانہ کے مشہور خوشنویس تھے، خصوصاً خط شکست بہت عمدہ لکھتے تھے[8]۔

راجہ امید سنگھ اور راجہ شیر سنگھ۔ راجہ بہادر کے لڑکے اور مشہور راجہ ناگرمل کے پوتے تھے، دونوں

---

۱ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۰۰ ۲ طبقات اکبری ص ۳۸۰ ۳ منتخب التواریخ ج ۳ ص ۲۰۱ ۴ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۷

۵ انکے حالات تاریخ عمل صالح، تذکرہ نشتر عشق، کلمات الشعراء وغیرہ فارسی شعراء کے تمام تذکروں میں ہیں ۶ تذکرۂ خوشنویساں ص ۵۵

۷ ایضاً ۸ ایضاً ص ۱۱۳

بھائی رائے پریم ناتھ کے شاگرد اور خوشخطی میں استاد کے ہم پایہ سمجھے جاتے تھے، اور خاندانی شرافت اخلاق سے آراستہ اور علم و ہنر کے بڑے قدردان تھے[1]۔

کنور پریم کشور فراقی۔ راجہ جگل کشور کے پوتے مشہور خوشنویس تھے، رائے پریم ناتھ کے طرز میں بہت اچھا لکھتے تھے، کلیات کلیم اور شاہجہاں نامہ خط شکست میں بہت عمدہ لکھا تھا، اردو کے خوشگوار شاعر تھے، فراقی تخلص تھا[2]، گلشن بیخار اور مولوی کریم الدین کے تذکرہ میں بھی ان کے حالات ہیں[3]۔

منشی لچھمن سنگھ غیوری۔ قوم کے اگروال، علم و ہنر کے زیور سے آراستہ تھے، عربی فارسی زبانوں میں پوری مہارت رکھتے تھے، فارسی کے اعلیٰ درجہ کے انشا پرداز تھے، اپنی انشا پر ان کو اتنا ناز تھا کہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، طاہر وحید، طاہر دکھنی اور میر جلالا کے طرز میں لکھتے تھے، شاعری میں میر شمس الدین فقیر سے تلمذ تھا، ان کی تصانیف میں شعلۂ آہ اور بعض دوسری کتابیں ان کی یادگار ہیں، خوشنویس بھی تھے، خط شکست میں محمد حفیظ خاں اور شفیعہ میں مرزا آقا کے شاگرد تھے، مولوی غلام محمد دہلوی کے ہمعصر تھے، دونوں میں ملاقات ہوئی تھی[4]، احمد علی سندیلوی نے ان کا ایک عجیب واقعہ لکھا ہے، ایک مرتبہ وہ کچھ کتابیں بیچنے کے لیے لکھنؤ آئے، کسی قدردان کی سفارش سے انگریزوں نے تین سو روپے ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کیا، مگر انھوں نے یہ کہہ کر اس کے لینے سے انکار کر دیا کہ میں کئی پشتوں سے اہل اسلام کا نمک خوار ہوں، اس لیے دشمنانِ دین کی ملازمت اختیار نہیں کر سکتا، خواہ فاقہ سے جان ہی چلی جائے[5]۔

---

۱ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۵ ۲ ایضاً ص ۱۱۶ ۳ گلشن بیخار ص ۲۱۹، اڈیشن ۱۸۴۳ء

۴ تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۸ ۵ مخزن الغرائب نسخۂ قلمی دارالمصنفین ص ۲۹۳

راجہ تند رام پنڈت ۔ یہ بھی صاحب علم و استعداد اور خط شکست کے ماہر تھے، دلی کی شاہ گردی کے زمانہ میں لکھنؤ چلے آئے تھے، اور نواب حسن رضا خاں کی سرکار میں منشی گیری کی خدمت پر مامور ہو گئے تھے۔[1]

لالہ لچھمی رام پنڈت ۔ عربی و فارسی میں مہارت رکھتے تھے، فارسی کے بہترین انشا پرداز تھے، مصوری میں بھی درک تھا، خط نستعلیق و شکست وغیرہ میں محمد حفیظ خاں کے شاگرد تھے، اور نستعلیق استاد کے طرز میں بہت اچھا لکھتے تھے، شاہ عالم کے وزیر نواب ذو الفقار الدولہ نجف علی خاں اور دوسرے امرا کی سرکاروں میں بڑی عزت و توقیر کے ساتھ زندگی بسر کی،[2]

خوشوقت رائے ۔ دانگی قوم کے کھتری، موروثی صاحب دولت و وجاہت اور علم و ہنر اور تہذیب و شایستگی کے زیور سے آراستہ تھے، خوشنویسی میں کمال حاصل تھا، خط شکست میں میر علی سے اور نستعلیق میں شاہ اعز الدین سے اصلاح لی تھی، یہ دونوں عرصہ سے ان کے یہاں مقیم رہے، کھتریوں میں ان کے جیسے صاحب علم، فیاض و سیر چشم اور علم و ہنر کے قدرداں کم پیدا ہوئے، ہزاروں روپے صرف کر کے آقا عبد الرشید دیلمی اور کفایت خاں کی دستخطی تحریریں جمع کی تھیں،[3]

لالہ درگا پرشاد کایستھ ۔ لکھنؤ وطن تھا، مولوی غلام محمد ہفت قلم کے شاگرد تھے، خط نسخ اور شکست اتنا عمدہ لکھتے تھے کہ موتی پروتے تھے،[4] شاعر بھی تھے، مضطرب تخلص تھا، گلشن بیخار میں بھی ان کا ذکر ہے،[5]

شنکر ناتھ ۔ کشمیری پنڈت دہلوی مشہور خوشنویس تھے، خط نستعلیق و شفیعہ میں مولوی غلام محمد دہلوی کے اور خط شکست میں مولوی حیات علی کے شاگرد تھے، شاعر بھی تھے، مودب

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۸ [2] ایضاً ص ۱۱۹ [3] ایضاً ص ۱۲۱ [4] ایضاً [5] گلشن بیخار اڈیشن سنہ ۱۸۴۳ء

تخلص تھا،[1] سرسید نے آثار الصنادید میں بھی ان کا ذکر کیا ہے،[2]

لالہ سرپ سنگھ دیوانہ ۔ خوشخطی میں حافظ نور اللہ کے شاگرد رشید تھے، شاعر بھی تھے، اور اردو، فارسی، ہندی تینوں زبانوں میں کہتے تھے، کئی دیوان یادگار چھوڑے،[3] خوشخطی میں استاد کا چربہ ایسا اڑایا تھا کہ سیکڑوں وصلیاں لکھکر ان کے نام سے پھیلا دیں جن میں بڑے بڑے ماہر تمیز نہیں کر سکتے تھے،[4] ان کا تذکرہ روز روشن، انیس العاشقین، گلشن ہند وغیرہ تمام تذکروں میں ہے۔

محمد حفیظ خاں کے شاگردوں میں لچھمی سنگھ اور لچھمی رائے پنڈت کے علاوہ جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، لالہ سکھ رام، منشی محبوب رائے اور منشی کسل سنگھ خط شکست میں بے نظیر مانے جاتے تھے[5] یہ اُن خوشنویسوں کے نام ہیں جن کا ذکر مولوی غلام محمد دہلوی نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، انکے علاوہ اور بھی ہندو خوشنویس تھے، جن کا ذکر کہیں نہیں ملتا، لکھنؤ میں اس کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز تھی، مولوی عبد الحلیم شرر لکھتے ہیں کہ یہ اس خاندان (حافظ نور اللہ و قاضی نعمت اللہ) کی برکت ہے کہ لکھنؤ میں ہزاروں مسلمان اور ہزاروں کایستھ جن سے نوبتہ اور اشرف آباد کے محلے بھرے ہوئے ہیں اور سیکڑوں کشمیری پنڈت خوشنویس ہو گئے، مگر افسوس کشمیری پنڈتوں نے انگریزی تعلیم کے شوق میں اور خوشنویسی کی کساد بازاری کو دیکھ کر اس فن کو مطلق چھوڑ دیا، اب جتنے اچھے لکھنے والے ہیں سب مسلمان ہیں یا کایستھ۔[6]

کتبہ نگار اور طغرا نویس

مسلمان سلاطین جو اہم عمارتیں بھی بنواتے تھے، ان میں ان کی تعمیر کی تاریخ کے علاوہ عمارت کی مناسبت سے آیات و احادیث اور فارسی اشعار وغیرہ بھی تحریر ہوتے تھے، یہ عبارتیں اتنے خوبصورت خطوں میں اور اس حسن و تناسب سے لکھی جاتی تھیں، خصوصاً ان کے طغرے، حسن صناعی کا ایسا اعلیٰ

[1] تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۲۲ [2] آثار الصنادید، ص ۲۲۵ [3] تذکرۂ خوشنویساں ص ۹۵ [4] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۱۸
[5] تذکرۂ خوشنویساں ص ۱۱۲ [6] مشرقی تمدن کا آخری نمونہ ص ۱۱۹

نمونہ ہوتے تھے کہ نقش ونگار کا بھی کام دیتے تھے، ان کے لکھنے والے مخصوص خوشنویس اور طغرانگار ہوتے تھے جنکی تنخواہیں بیش قرار ہوتی تھیں مغلوں کی کوئی اہم اور تاریخی عمارت اس قسم کی تحریروں سے خالی نہیں ہے خصوصاً تاج محل، سکندرہ اور فتحپور سیکری کی عمارتوں اور جامع مسجد دہلی کے کتبات اور طغرے حسن صناعی کا اعلیٰ نمونہ ہیں، جن کو دیکھکر آج بھی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

سکندرہ اور تاج محل کے بیشتر کتبات اور طغرے امانت خاں شیرازی کے لکھے ہوئے ہیں، یہ جہانگیری دور کا طغریٰ نویس تھا، اس کا اصل نام عبد الحق ہے، امانت خاں خطاب تھا، اسکی تنخواہ ایک ہزار ماہوار تھی، اسکے لکھے ہوئے کتبات میں اسکا نام تحریر ہے، تاج محل کی تحریروں کے خطاطوں میں ستار خاں، محمد خاں اور عبد الغفار کے نام بعض کتابوں میں ملتے ہیں، ان کی تنخواہ پانچ پانچ سو ماہوار تھی، تاج محل کی تحریروں میں جو حسن و دلکشی ہے، اس کا اندازہ ایک ظاہر بیں بھی کر سکتا ہے،

فتحپور سیکری کے بلند دروازوں کے مختلف حصوں میں کئی کتبے ہیں، ان میں سے بعض کتبے حضرت سلیم چشتی کے خلیفہ خواجہ احمد چشتی کی عقیدت کا نتیجہ ہیں، جو اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے، اور بعض کتبے میر معصوم بھکری قندھاری اور احمد علی ارشد کے لکھے ہوئے ہیں، اول الذکر دونوں کے حالات تذکرۂ خوشنویساں میں بھی ہیں، بھکری کے حالات اوپر لکھے جا چکے ہیں۔

جامع مسجد دہلی کے بیرونی درجہ کی محرابوں کے اوپر جامع مسجد کی تعمیر کی جو مفصل تاریخ تحریر ہے وہ شاہجہانی دور کے مشہور مہندس استاد احمد معمار کے لڑکے نور اللہ احمد کی لکھی ہوئی ہے۔[1]

اس قسم کے کتبات اور تحریروں سے مغلوں کی کوئی عمارت بلکہ امرا کی بنائی ہوئی عمارتیں بھی خالی نہیں مگر اس کی تفصیل مقصود نہیں، صرف چند مشہور عمارتوں کے کتبات کا اجمالی ذکر کر دیا گیا۔

---

[1] ان تمام کتبات اور تحریروں پر ان کے کاتبوں کے نام درج ہیں، اس کے علاوہ تاریخ فتحپور سیکری مولوی محمد سعید مارہروی واقعات دار الحکومت دہلی مولفہ مولوی بشیر احمد خاں دہلوی اور تاریخ آج محل معین الدین احمد اکبرآبادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے قابل قدر مضمون "تاج محل اور اس کے معمار" میں بھی اس کی تصریح ہے۔

شریعت کے بنیادی ماخذ

ترجمہ مولوی حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی

مصطفیٰ احمد الزرقاء دمشق یونیورسٹی کے لاکالج میں جدید وضعی قانون اور اسلامی فقہ کے پروفیسر ہیں اور ان دونوں پر عالمانہ اور محققانہ نظر رکھتے ہیں، اور ان موضوعات پر انھوں نے تقریباً نصف درجن سے زیادہ ضخیم کتابیں لکھی ہیں، خاص طور پر اسلامی فقہ کے مختلف گوشوں پر "الفقہ فی ثوبہ الجدید" کے نام سے انھوں نے موجودہ حالات وضروریات کے پیش نظر ایک طویل سلسلۂ تصنیفات شروع کیا ہے، اسی سلسلہ کی ایک اہم اور مقبول کتاب المدخل الفقہی العام ہے جس کا ترجمہ "فقہ اسلامی نئے لباس میں" کے عنوان سے دار المصنفین میں ہو رہا ہے، اس ترجمہ کا ایک حصہ یہاں دیا جا رہا ہے، یہ کتاب حقیقتاً اس الزام کے جواب اور اس خیال کی تردید میں لکھی گئی ہے کہ فقہ اسلامی ایک جامد مجموعۂ قانون ہے جو موجودہ برق رفتار حالات اور ایٹمی دور کی وسیع ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اسلامی قانون کے ماخذ شریعت اسلامی کے اساسی اور بنیادی ماخذ چار ہیں، کتاب، سنت، اجماع، قیاس۔

ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں کہ فقہ اسلامی کے مسائل کا حکم یا تو ماخوذ ہوگا قرآن کے نص[1] صریح یا سنت نبویؐ سے یا علمائے امت کے اجماع سے یا ان کا مدار کتاب وسنت کے منشاء، اشارات، اور قواعد شرعیہ کے مطابق مجتہدین کے استنباطات ومجتہدات پر ہوگا، اسی بنا پر علمائے امت نے شریعت

---

[1] نص کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے۔

کے بنیادی آخذ چار قرار دیے ہیں: الکتاب، السنۃ، الاجماع اور القیاس۔

الکتاب سے مراد قرآن مجید[1] ہے، اسلامی شریعت کی اصل بنیاد یہی ہے، اس میں اسلامی شریعت کی تمام بنیادیں بھی بیان کر دی گئی ہیں اور اس تک پہنچنے کے سارے نشاناتِ راہ بھی واضح کر دیے گئے ہیں، البتہ عقائد میں ذرا زیادہ تفصیل و توضیح سے کام لیا گیا ہے، اور عبادات اور حقوق انسانی کے بیان میں قدرے اجمال ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اسلامی شریعت میں قرآن کی وہی حیثیت ہے جو انسان کے وضع کردہ قانون میں دستور[2] (کانسٹی ٹیوشن) کی ہوتی ہے، یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بھی نمونہ اور رہنما ہے اور امت کے لیے بھی، اسی وجہ سے اس کو اسلامی قانون سازی کا اصل سرچشمہ قرار دیا گیا ہے، مگر قرآن اپنی اس دستوری صفت کے باوجود احکام کے بیان میں اجمال[3] سے کام لیتا ہے، وہ قانونی جزئیات اور ان کی کیفیات کی تفصیل بہت کم بیان کرتا ہے، کیونکہ تفصیلات کی طوالت سے قرآن کے دوسرے مقاصد مثلاً بلاغت کلام و اعجاز بیان وغیرہ فوت ہو جاتے، مثلاً قرآن میں نماز اور زکوٰۃ کا حکم مجمل طور پر دیا گیا ہے، نہ تو اس کی

---

[1] کتاب اللہ کی اصطلاحی تعریف یہ کی گئی ہے ھو القرآن المنزل علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم المکتوب فی المصاحف المنقول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم نقلاً متواتراً بلا شبہۃ وھو النظم والمعنی (شرح اصول بزدوی کاج ۱ ص ۲۲-۲۳) لیکن قرآن کی تعریف میں یہ تمام قیدیں علمائے امت نے اس وقت سے لگائی ہیں جب نفی صفات الٰہی اور خاص طور پر خلق قرآن کا مسئلہ پیدا ہوا، ورنہ عہد صحابہ تک الکتاب یا کتاب اللہ کہنا ہی اسکے لیے کافی تھا۔

[2] یہ اشارہ ہے اس قانونی اصطلاح کی طرف جس کے اعتبار سے علمائے قانون قانون (Law) اور دستور یعنی کانسٹی ٹیوشن (Constitution) میں فرق کرتے ہیں۔

[3] مجمل حکم کی اصطلاحی تعریف علمائے اصول نے یہ کی ہے فان کان البیان مرجواً جس کا بیان کرنا ممکن ہو (بزدوی ص ۲۸)

پوری کیفیت[1] بتائی گئی ہے، اور نہ تعداد و مقدار وغیرہ کی تفصیل کی گئی ہے، اس کی تفصیل سنت یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و فعل نے کی ہے، اسی طرح قرآن میں ہر طرح کے معاہدات و عقود کو پورا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اور بیع و شرا کی حلت، اور سود کی حرمت کا بھی مجملاً حکم دیا گیا ہے، مگر تفصیل کے ساتھ اس بات کی پوری نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ بیع و شرا کے کون کون سے معاہدات اور لین دین کے کون کون سے طریقے صحیح اور حلال ہیں، جن پر عمل درآمد ضروری ہے، اور کون کون سے طریقے اور معاہدے باطل اور فاسد ہیں، اور ان کی تعمیل و تکمیل ضروری نہیں ہے، ان معاملات میں بھی حرام و حلال میں فرق و تمیز کرنے کی دلیلیں اور بنیادیں سنت ہی فراہم کرتی ہے۔

قرآن کی عمومی خصوصیت تو یہی ہے، مگر بعض معاملات میں وہ احکام کی جزئیات بھی بیان کر دیتا ہے، مثلاً وراثت[2]، لعان، بعض حدود اور ان کی سزاؤں کی قرآن میں کافی تفصیل موجود ہے، اسی طرح محرمات نکاح یعنی ان عورتوں کا ذکر بھی تفصیل سے ہے جن سے نکاح ہمیشہ حرام ہے۔

قرآن کی یہ ایک دوسری بڑی خصوصیت اور اس کا شرف ہے کہ اس نے تمدنی احکام یا اجتماعی اور سیاسی معاملات کے بیان میں اجمال سے کام لیا، کیونکہ اجمال ہی یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ ان احکام پر غور کیا جائے اور جہاں تک نصوص قرآنی اجازت دیں ان مجمل احکام کو مختلف صورتوں پر منطبق کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ اس کے احکام زمانہ کے مصالح و ضروریات کے پورا کرنے کے قابل بن سکیں۔

---

[1] اگر کیفیت سے مراد ظاہری ارکان کی ادائیگی کی کیفیت ہے تو اس کی تفصیل قرآن میں صراحۃً موجود نہیں اگرچہ اشارۃً دلالۃً موجود ہے، لیکن اگر اس سے مراد نماز و زکوٰۃ کی باطنی کیفیت ہے تو اس کو قرآن نے واضح طور پر بیان کر دیا ہے، مثلاً خشوع و خضوع، اخلاص، حسن نیت وغیرہ۔

[2] سورۂ نساء کے رکوع ۲ میں اور اس کے اختتام کی دو آیتوں میں وراثت کی تفصیل موجود ہے، لعان کی تفصیل سورۂ نور میں اور محرمات کی تفصیل سورۂ نساء رکوع ۴ میں، اور حدود کا ذکر سورۂ نور اور سورۂ مائدہ وغیرہ میں ہے۔

اور اس وقت تک اس کے احکام کے ذریعہ، زمانہ کے مقتضیات کو پورا کیا جائے، جب تک کہ ان مقتضیات پر عمل کرنے میں شریعت کے بنیادی اصول اور مقاصد کو خیرباد نہ کہہ دینا پڑے۔

اس کی وضاحت اس مثال سے ہوسکتی ہے کہ قرآن نے سیاسی معاملات کے سلسلہ میں "شوریٰ"[1] کا حکم دیا ہے، لیکن اس کی کوئی مخصوص شکل نہیں بتائی گئی ہے، اس لیے یہ حکم اب ہر اس نظام حکومت کو شامل ہوگا جس میں استبداد اور ڈکٹیٹرشپ نہ ہو، اور جس میں مشاورت اور امت کے ارباب علم اور اہل الرائے کی رایوں کا احترام کیا جاتا ہو، خواہ یہ سیاسی نظام جمہوری طرز کا ہو یا دستوری بادشاہی طرز کا ہو[2]، یا ان کے علاوہ کوئی اور نظام حکومت مصلحت عامہ کے تحت ایسا قائم ہو جس میں کسی فرد یا کسی جماعت[3] کو مستقلاً کوئی ترجیح نہ دی گئی ہو۔

اس خصوصیت کے باوجود قرآن کے یہ مجمل احکام سنت نبوی کی توضیح و تبیین کے بھی محتاج ہیں، تاکہ ان احکام کی کیفیات و کمیات کی تعیین و تطبیق ہوسکے اور وہ حدود معلوم کیے جاسکیں جن سے یہ پتہ چل سکے کہ اس حکم میں فلاں فلاں صورتیں شامل ہیں اور فلاں فلاں صورتیں اس حکم سے خارج ہیں۔

---

[1] اشارہ ہے قرآن کے اس حکم کی طرف: وامرہم شوریٰ بینہم (سورۂ شوریٰ) وشاورہم فی الامر (سورۂ آل عمران) مترجم

[2] موجودہ دور میں دستوری بادشاہت انگلستان، ایران وغیرہ میں ہے اور اس سے پہلے جاپان، مصر، عراق وغیرہ میں بھی، دستوری بادشاہت سے مصنف کی مراد اگر ان حکومتوں کا نظام سیاسی ہے تو اس سے راقم کو اختلاف ہے، اس طرز حکومت میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اس سے نسلی تعصب اور ایک خاص خاندان کی برتری کا مستقل موقع فراہم کیا جاتا ہے اور یہ طرز حکومت اسلام کی سیاسی شورائیت سے میل نہیں کھاتا اور اگر اس سے کچھ اور مراد ہے تو اس کی وضاحت ہونی چاہیے تھی۔ [3] مثلاً اشتراکی نظام میں کمیونسٹ پارٹی کو مستقل طور پر حکمرانی کی ترجیح ہوتی ہے، اس پارٹی کے افراد کے لوگ تو اقتدار کے حاصل کرنے میں رسہ کشی کرسکتے ہیں، مگر کوئی دوسری سیاسی یا اجتماعی تنظیم نہیں بناسکتے۔ (مترجم)

اور پیش آمدہ مسائل و معاملات کو ان پر منطبق کیا جاسکے، اسی بنا پر ان تفصیلات میں سنت نبوی پر عام اعتماد کا حکم قرآن میں دیا گیا ہے کہ

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ[1] — جو کچھ تمہیں رسول دیں وہ لے لیا کرو، اور
وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (حشر) — جس سے روک دیں رک جایا کرو،

اسی بنا پر سنت نبوی کو کتاب اللہ کی کنجی کہا جاتا ہے (جس سے اس کے معنی کا قفل کھلتا ہے)

السنۃ سنت کا اطلاق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول، فعل اور تقریر[2] سب پر ہوتا ہے، اس اعتبار سے یہ لفظ "حدیث" کے مرادف ہے، لیکن کبھی اس کا اطلاق عہد نبوی (اور خلفائے راشدین) کے تعامل پر بھی ہوتا ہے۔ ان دونوں میں جو فرق ہے اس کا نتیجہ[3] اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] اس کے علاوہ قرآن کی متعدد آیات ہیں جو قرآن کے احکام کی تفصیل و تبیین میں، سنت کی ضرورت پر وضاحت سے روشنی ڈالتی ہیں وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس — ہم نے تمہارے اوپر ذکر (قرآن) نازل کیا تاکہ تم لوگوں پر انکے مضامین کی وضاحت کرو۔ یہ سورہ نحل کی آیت ہے، اسی سورۃ میں چند آیات کے بعد پھر کہا گیا ہے: وانزلنا علیک الکتاب الا لتبین لهم الذی اختلفوا فیہ یعنی قرآن کے مفہوم کی تعیین اور پیش آمدہ مسائل اور اختلافی امور میں جو تفسیر و تبیین رسول نے کردی ہو وہ قابل اعتبار اور قابل اعتماد ہو کیونکہ یہ منصب آپ کو خدا ہی نے دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ علماء نے ہمیشہ یہ لکھا ہے کہ السنۃ تفسر الکتاب قرآن کی ایک اور آیت ہے جس میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سخت وعید کی گئی ہے، یہ آیت سنت کے ماخذ شریعت ہونے پر بڑی زبردست دلیل ہے، وہ آیت یہ ہے: فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبهم فتنة او یصیبهم عذاب الیم [2] تقریر کا مطلب یہ ہے کہ کوئی کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی یا آپ کے زمانہ میں کیا گیا ہو اور آپ نے اس فعل کو دیکھا یا سنا ہو اور اس سے روکا نہ ہو۔ [3] عبدالرحمن بن مہدی جرح و تعدیل کے امام ہیں ان سے کسی نے سفیان ثوری اور امام اوزاعی کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا سفیان ثوری حدیث کے امام ہیں، اور امام اوزاعی سنت کے امام ہیں اور امام مالک دونوں کے جامع ہیں، (شرح موطا زرقانی) اس قول میں اسی

(باقی حاشیہ ص [illegible])

ے ایک قولی حدیث ایک حکم کے بارے میں منقول ہوتی ہے لیکن تاریخی طور پر علماء کے نزدیک یہ بات
پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ عہد نبوی میں تعامل اس کے خلاف تھا، یا خلفائے راشدین کے زمانہ میں
ایک طویل مدت تک اس حدیث کے خلاف عمل درآمد ہوتا رہا، تو اس وقت یہ کہا جاتا ہے کہ حدیث میں
تو اس طرح آتا ہے، مگر سنت اور تعامل اس طرح ہے۔

اس صورت میں اگر حدیث وسنت دونوں صحیح طریقہ سے ثابت ہوجائیں تو علماء دونوں میں
تطبیق دینے کی کوشش کرتے ہیں، اگر ان میں تطبیق نہیں ہوپاتی تو ان میں سے کسی ایک کی ترجیح کے اسباب
موجود ہوتے ہیں تو وہ اس کو مرجح قرار دیتے ہیں، جس طرح کہ جب دو صحیح قولی حدیثوں میں تعارض ہوجاتا
ہے تو ان میں سے ایک کو دوسری کا ناسخ سمجھا جاتا ہے، اور پھر ان دونوں کے بارے میں یہ غور کیا جاتا
ہے کہ کون ناسخ ہے اور کون منسوخ۔

کتاب اللہ کے بعد اسلامی قانون سازی کا دوسرا ماخذ سنت ہے، اور یہ ماخذ اس حیثیت سے
ہے کہ یہ قرآن کے مجمل احکام کی تفصیل اور اس کے مشکل[1] احکام کی توضیح کرتی ہے مطلق حکم کو

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۷) فرق کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں حدیث و روایت کے فرق پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے،
اس فرق پر نظر نہ رکھنے کی وجہ سے حدیث وسنت کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں، حدیث یا سنت کی حیثیت
متن کی ہے اور روایت کی حیثیت جسم و قالب کی، یا حدیث وسنت متن کو کہتے ہیں اور روایت سلسلۂ سند کو یعنی حدیث و سنت
میں جو بات بیان کی جاتی ہے اس کے لیے روایت ایک ذریعہ ہوتی ہے، اس لیے ایسا ہوتا ہے کہ ایک ہی حدیث یا سنت
کے بیان کے لیے مختلف روایتیں ہوتی ہیں اسی بنا پر حدیث کی کتابوں میں جہاں یہ ذکر آتا ہے کہ یہ روایت ضعیف یا شاذ ہے
تو اس کا مطلب لامحالہ یہ نہیں ہوتا کہ اس حدیث یا سنت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، بلکہ مقصد صرف اس کے سلسلۂ سند یا
اس کے ناقل کے عیب کو ظاہر کرنا ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہی حدیث دوسری روایت یا سلسلۂ سند کے ذریعہ صحیح طریقہ پر مروی ہو۔

[1] علمائے اصول کے بیان میں مشکل وہ حکم ہے جس کی مراد ظاہر نہ ہو، اس کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ عبارت ہی ایسی ہو کہ
(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۹ پر)

مقید[1] کرتی ہے، اور جو کچھ قرآن میں مذکور نہیں ہوتا اس کو بھی معلوم کرتی ہے،
اس حیثیت سے تو سنت بھی شریعت اسلامی کا ایک مستقل ماخذ ہے کہ اس کے ذریعہ کتنے
ایسے احکام ملتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہوتا، لیکن دوسری حیثیت سے وہ قرآن کی تابع بھی ہے
کیونکہ باوجود اس کے وہ قرآن کی تفصیل و وضاحت کرتی ہے، مگر وہ قرآن کے بنیادی اصول
اور عمومی قواعد سے باہر نہیں جاتی حتیٰ[2] کہ ان احکام میں بھی جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے،

(بقیہ حاشیہ ص ۱۱۸) اس کی مراد ظاہر نہ ہو، یا دوسری کسی عبارت کی وجہ سے اس میں پیچیدگی پیدا ہوگئی ہو تو
دوسری صورت کو خفی اور پہلی صورت کو اس وقت مشکل کہیں گے جب غور و فکر سے عبارت کا مفہوم معلوم کیا جاسکے
(شرح بزدوی)

[1] جب کوئی لفظ اپنی عمومیت پر باقی ہو اور کوئی دوسرا لفظ اس عمومیت کو ختم نہ کرتا ہو تو اس کو مطلق کہتے ہیں،
اور اگر کوئی لفظ اس کی عمومیت میں کوئی قید لگا دیتا ہو تو پھر وہ مقید ہوجاتا ہے، مثلاً کہیں کہ جاؤ رجل تو یہ
رجل مطلق کہا جائے گا، اور اگر رجل کے ساتھ رشید کی قید لگا دیں تو اب رشید کی قید کی وجہ سے رجل کا لفظ
مقید ہوجائے گا، مقید ہی کی ایک شکل تخصیص ہے، مگر دونوں میں یہ فرق ہے کہ تخصیص میں اسی لفظ ہی سے قید ظاہر
ہوجاتی ہے لیکن مقید میں اس لفظ سے وہ قید ظاہر نہیں ہوتی۔

[2] مقصد یہ ہے کہ مستقل حیثیت کے باوجود قرآن کی روح اور بنیادی تصورات کے خلاف کوئی بات صحیح
سنت نبوی میں نہیں ہوسکتی، بلکہ اس کی روح کے پیش نظر مزید احکام دیتی ہے، مثلاً قرآن نے معاملات میں
یہ قید لگائی ہے لا تظلمون ولا تظلمون، لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل، یا تجارت میں تراضی
کی شرط لگائی ہے، اب حدیث میں ظلم کرنے اور ظلم سہنے کی پوری تفصیل ملے گی، اسی طرح اکل بالباطل کی
پوری وضاحت ملے گی، تراضی اور عدم تراضی کی مختلف صورتوں کی تعیین حدیث میں ملے گی، تو اس حیثیت سے
کہ اس نے قرآن کی عمومی روح اور اس کے اصول کو نظر انداز نہیں کیا، سنت، قرآن کی تابع ضرور ہے لیکن
اس حیثیت سے وہ جدا بھی ہے کہ وہ مزید مستقل احکام دیتی ہے، گویا وہ احکام قرآن کی اصل روح سے باہر نہیں ہوتے۔

توحقیقۃً سنت کا مرجع و ماخذ بھی قرآن ہی کے احکام اور اصول ہیں، سنت نبوی عام حالت میں فہم قرآن کے لیے انتہائی ضروری ہے، یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص قرآن کو صحیح طور پر سمجھے اور اس کے احکام کے موقع و محل کی تعیین میں اس سے صرف نظر کر سکے، اگرچہ ان میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں، جن کا سمجھنا قرآن کے سمجھنے پر موقوف نہیں ہے۔ (لیکن یہ باتیں قرآن کی روح اور منشاء کے خلاف نہیں ہوں گی)

یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ حدیث و سنت کی نقل و روایت کا کام عہد نبوی کے بعد شروع ہوا یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد، جب آپ کے ارشادات کا سلسلہ ختم ہوا (تو لوگوں نے حفاظت کے خیال سے ان کو اپنے سینوں اور سفینوں میں روایت و کتابت کے ذریعہ باقاعدہ محفوظ کرنا شروع کیا[1]) اس لیے اسلامی فقہ کی تشکیل میں ان ہی احادیث کو قبول کیا جائیگا،

[1] اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی موجودگی میں لوگ اس کی روایت یا کتابت نہیں کرتے تھے۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اہتمام اس وقت شروع ہوا جب یہ چشمۂ فیض ظاہری طور پر امت کی مادی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، یہاں یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بعض لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، یا قصداً اس غلط فہمی میں لوگوں کو مبتلا کرتے ہیں کہ کتابت حدیث کا کام ایک صدی بعد شروع ہوا، حالانکہ اب جبکہ عہد صحابہ کے حدیث کے مجموعے سامنے آگئے ہیں، مثلاً صحیفۂ ہمام بن منبہ وغیرہ، اس غلط فہمی کی کوئی گنجائش نہیں ہے، لیکن اگر بفرض محال یہ مجموعے ہمیں نہ بھی ملتے تو اس سے حدیث کے بارے میں جو غلط فہمی پیدا کرنے کی کوشش کیجاتی ہے وہ اس وجہ سے صحیح نہیں ہے کہ اگر کتابت حدیث کا کام کچھ دن بند رہا تو روایت حدیث کا کام تو ایک دن بھی بند نہیں رہا بلکہ وہ تو تسلسل کے ساتھ آج تک جاری ہے، کیا دنیا میں کسی رہنما کے ارشادات کی اتنے تسلسل کے ساتھ محض روایت کی بھی کوئی مثال موجود ہے؟ یہ بات ان کے دعوی کو تسلیم کر کے کہی گئی ہے، ورنہ تاریخی حیثیت سے یہ بات غلط ہے کہ کتابت حدیث کا کام ایک صدی بعد شروع ہوا، جن روایتوں کی بنا پر یہ رائے قائم کی جاتی ہے ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کتابت حدیث کا کام ایک صدی بعد شروع ہوا، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تدوین حدیث کا باقاعدہ کام ایک صدی بعد شروع ہوا،

(باقی حاشیہ ص ۱۲۱ پر)

جن کی صحت کا پورا ثبوت مقررہ شرائط کے مطابق مل جائے، اس کی تمیز کے لیے علمائے حدیث نے ایسے اصول بنا دیے ہیں جن سے ہر حدیث کے بارے میں یہ اچھی طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کس درجہ کی حدیث ہے۔

الاجماع[1] کسی حکم شرعی پر ایک زمانہ کے عام فقہائے مجتہدین کے اتفاق رائے کر لینے کو اجماع کہتے ہیں۔ (یہ اسلامی شریعت کا تیسرا ماخذ ہے)

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۰) کتابت حدیث اور تدوین حدیث میں بڑا فرق ہے، تمام اسلامی علوم کی تدوین ایک ڈیڑھ صدی بعد شروع ہوئی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان علوم کا کوئی وجود اس سے پہلے نہیں تھا، مثلاً تفسیر، فقہ وغیرہ کی تدوین ایک صدی بعد ہوئی مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں قرآن کی تفسیر اور اجتہاد و استنباط کا کام بالکل بند تھا، جو ایسا سمجھتا ہے اسکو اپنے علم و دانش پر ماتم کرنا چاہیے۔

[1] اجماع کے لفظی معنی دو ہیں، ایک کسی کام کا عزم مصمم کر لینا، دوسرے کسی بات پر اتفاق رائے کر لینا چنانچہ جب بولتے ہیں اجمع فلان علی کذا تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس نے اس کام کا پختہ ارادہ کر لیا، قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر اسی معنی میں آیا ہے فَاَجۡمِعُوۡۤا اَمۡرَكُمۡ (یونس - ۷) اپنی تدبیر اچھی طرح مضبوط کر لو، حدیث میں آتا ہے لاصیام لمن لایجمع الصیام من اللیل یعنی جس نے رات ہی سے پختہ ارادہ نہیں کر لیا، اس کا روزہ نہیں، اسی طرح جب بولتے ہیں کہ اجمع القوم علی کذا تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ لوگوں نے فلاں فلاں بات پر اتفاق کر لیا، قرآن میں ہے اذ اجمعوا امرھم جب وہ اپنی بات پر متفق الرائے ہو گئے، واجمعوا ان یجعلوہ اور متفق ہوئے کہ انکو کنوئیں میں ڈال دیں، گو اس معنی میں بھی عزم کے معنی پائے جاتے ہیں، (مولف)

پہلے معنی کے اعتبار سے اس کا اطلاق ایک آدمی پر بھی ہو سکتا ہے، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے دو سے کم آدمی پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا، اجماع کی جو شرعی تعریف کی گئی ہے اسمیں یہ دونوں معنی پائے جاتے ہیں۔

کسی مسئلہ یا حکم پر اتفاق رائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد خواہ فقہائے صحابہ کی طرف سے ہوا ہو یا ان کے بعد کے کسی اور عہد کے مجتہدین و فقہا کی طرف سے، دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے[1]،

اجماع حجت ہے

سنت نبوی کے بعد احکام فقہی کے ثبوت کے لیے سب سے قوی دلیل اجماع ہے۔

اور اس کو ماخذ شریعت قرار دینے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی متعدد آیات اور احادیث نبوی سے پتہ چلتا ہے کہ امت کے اہل علم اور اہل رائے افراد کے اتفاق رائے کا اعتبار و لحاظ کرنا چاہیے، اس لیے کہ ان سے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ سب کے سب کسی ایسے امر پر اتفاق رائے کر لیں جس کے لیے ان کے پاس کوئی شرعی دلیل موجود نہ ہو،

اجماع کی صحت اور اس کے دلیل شرعی ہونے کے جو دلائل ہیں، ان میں یہ حدیث نبوی بھی ہے، آپ نے فرمایا کہ

لا تجتمع امتی علی الضلالة[2] — میری امت بحیثیت مجموعی گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی،

---

[1] کشف الاسرار میں اس تعریف میں صرف ایک لفظ کا اضافہ کیا ہے من هذه الامة، یعنی اجماع سے مراد امت مسلمہ کے مجتہدین کا اجماع ہے، اس تعریف میں جتنی قیدیں لگائی گئی ہیں وہ سب احترازی ہیں یعنی ان میں فلاں فلاں باتیں شامل نہیں ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ اجماع کسی خاص دور یا طبقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ وہ ہر دور اور ہر طبقہ کا حق ہے، یہ ان لوگوں کا جواب ہے جو اجماع کو یا تو حجت نہیں مانتے، جیسے بعض روافض اور معتزلہ وغیرہ، یا اس کو صرف صحابہ کے لیے مخصوص کرتے ہیں، جیسے داؤد ظاہری وغیرہ، یہ ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ اجماع صرف اہل بیت نبوی کا معتبر ہے، جیسے عام امامیہ اور زیدی شیعہ وغیرہ، یہ ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو صرف اہل مدینہ کے اجماع کے قائل ہیں، جیسے امام مالک وغیرہ۔ (کشف الاسرار ج ۳)

[2] اس روایت کے راوی حضرت عمرؓ، حضرت ابن عمرؓ، ابن مسعودؓ، ابو سعید خدریؓ، انسؓ، ابوہریرہؓ اور حذیفۃ النعمانؓ جیسے اجلۂ صحابہ ہیں، اس کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری امت (باقی ص ۱۲۳ پر)

اور اس مفہوم کی اور بہت سی حدیثیں ہیں[1]، جو ایک دوسرے کے ہم معنی ہیں، اور ان احادیث کے ساتھ ان قرآنی آیات کو جن میں اجتماعیت کی تاکید اور افتراق و اختلاف سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے، ملالیا جائے تو ان سب سے معلوم ہوگا کہ اثبات حکم کے لیے اجماع بھی ایک قوی دلیل اور ماخذ شریعت ہے۔

جب کسی مسئلہ پر اجماع ہوتا ہے تو وہ فی نفسہ بلا دلیل نہیں ہوتا، بلکہ اس میں کوئی نہ کوئی دلیل شرعی پوشیدہ ہوتی ہے، اگرچہ اس مسئلہ کے ذکر کے وقت اس دلیل شرعی کا ذکر نہ کیا جائے، اس لیے کہ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ فقہائے امت بغیر کسی دلیل شرعی کے محض اپنی ذاتی خواہش کی بنا پر کسی مسئلہ کے حکم شرعی ہونے پر اتفاق کر لیں، جیسا کہ اس سے پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے،

اسی بنا پر متاخرین فقہا جب کسی مسئلہ کے اجماعی ہونے کو معلوم کرنا چاہتے تو وہ اس دلیل کو تلاش نہیں کرتے جس کی بنا پر اجماع ہوا ہے، بلکہ وہ صرف یہ معلوم کرتے ہیں کہ اس مسئلہ

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۲) کبھی گمراہی پر متفق نہیں ہو سکتی، اور جب مجموعی حیثیت سے عام امت غلط بات پر متفق نہیں ہو سکتی تو پھر اہل علم اور اہل رائے کیسے کسی غلط بات اور گمراہی پر متفق الرائے ہو سکتے ہیں، اجماع کے سلسلے میں یہ موقوف حدیث بھی پیش کی جاتی ہے، ما رآہ المسلمون حسنا فهو عند الله حسن، اس حدیث میں المسلمون سے مراد عوام نہیں خواص امت ہیں، تمام شراح حدیث یہی لکھتے ہیں، ان احادیث کے علاوہ قرآن کی دو آیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَىٰ وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ ط اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو راہ اہل ایمان اختیار کرتے ہیں، وہ حق ہی ہوتی ہے، البتہ ان کا اہل ایمان ہونا شرط ہے، اہل ایمان سے وہی لوگ مراد ہوں گے جن کی زندگی مومنین سابقین یعنی صحابہ کی زندگی کا علمی اور عملی، دونوں لحاظ سے پرتو ہو۔

[1] مثلاً لا تزال طائفة من امتی علی الحق حتی یاتی امر الله، میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر رہیگا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

پر اجماع کا ہونا ثابت ہے یا نہیں، اس لیے کہ اگر وہ دلیل کی تلاش کریں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اصل اعتبار دلیل کا ہے، اجماع[1] کا نہیں، حالانکہ اجماع بذات خود دلیل وحجت ہے[2]،

خلاصہ یہ ہوا کہ اجماع کسی نہ کسی مستند دلیل ہی پر مبنی ہوتا ہے، لیکن مجمع علیہ مسئلہ کے ساتھ اس کا مذکور و معلوم ہونا ضروری نہیں ہے۔

---

[1] فالاجماع ما وقع الا عن دلیل الا انه لم ینقل الینا استغناءً بالاجماع عنه لان ایجاب الحکم به قطعاً لم یثبت من قبل دلیله بل من قبل عینه کرامة للامة (کشف اسرار ج ۳ ص ۹۸۵)

یعنی اجماع کسی دلیل ہی کی بنا پر ہوتا ہے، لیکن اس کے ذکر کی کوئی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ اس کا وقوع کسی حکم کو خود ہی قطعی بنا دیتا ہے، اور یہ امت مسلمہ کا خاص اعزاز ہے" یہ دلیل شرعی جس کی بنا پر اجماع ہوتا ہو وہ کس درجہ کی ہو، تو جمہور امت اس کے قائل ہیں کہ وہ دلیل خبر واحد اور قیاس بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ خبر واحد اور قیاس پر اجماع ہو جانا اس کو قطعی بنا دیتا ہے، لیکن داؤد، ظاہری شیعے اور اہل سنت میں ابن جریر طبری اسکے قائل ہیں کہ اخبار احاد اور قیاس سے کوئی قوی دلیل وقوع اجماع کے لیے ہونی چاہیے، جمہور کی دلیل دو ہے، ایک تو یہ کہ صحابہ کے زمانہ میں خبر واحد اور قیاس کو دلیل بنا کر اجماع ہوا ہے، دوسرے یہ کہ شریعت نے اجماع کے لیے دلیل قطعی کی قید نہیں لگائی ہے، راقم کے خیال میں اس لیے بھی اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر دلیل قطعی موجود ہو تو پھر اجماع کا فائدہ ہی کیا ہے،

[2] جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ دلیل ہوتی ضرور ہے، مگر اس کا ذکر ضروری نہیں ہے، اس کا ذکر اس لیے ضروری نہیں ہے کہ جب شریعت نے امت کو اس بات کی اجازت دی ہے تو پھر جب وہ کسی مسئلہ پر مجتمع ہو جاتی ہے تو اس کے بارے میں حسن ظن رکھنا چاہیے کہ وہ بغیر کسی دلیل شرعی کے مجتمع نہیں ہو سکتی، اور جب اس سے یہ حسن ظن ہے تو پھر اس سند کی دلیل تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ یہ تو خود ہی ایک دلیل ہے۔

اجماع کے ذریعہ جن احکام کی شرعی حیثیت تسلیم کر لی گئی ہے، ان میں لڑکے کے ساتھ دادا کی میراث ہے، یعنی اگر کوئی مورث ایک لڑکا اور باپ کو چھوڑ کر مر جائے، تو اس کی میراث میں باپ کو ۱/۶ حصہ ملے گا، اب اگر باپ زندہ نہ ہو بلکہ مورث کا دادا زندہ ہو تو باپ کا قائم مقام دادا سمجھا جائیگا، اور اس کو بھی ۱/۶ ملے گا، اس مسئلہ کے بارہ میں صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے۔

اسی طرح اجماع ہو چکا ہے کہ میت کے باپ کی موجودگی میں اس کے حقیقی اور علاتی بھائی بہن وراثت سے محروم رہیں گے[1]، اسی طرح بیع استصناع[2] کی صحت پر بھی اجماع ہو چکا ہے،

---

[1] بھائی تین طرح کے ہوتے ہیں، ایک حقیقی، دوسرے علاتی، تیسرے اخیافی، حقیقی بھائی بہن وہ ہیں جن کے ماں باپ ایک ہوں، اور علاتی بھائی بہن وہ ہیں جن کے باپ تو ایک ہوں، مگر مائیں دو ہوں اور اخیافی جن کے باپ دو ہوں اور ماں ایک ہو، اخیافی بھائی بہن ذوی الفروض میں داخل ہیں، اور حقیقی، علاتی بھائی بہن عصبات ہیں، اس مسئلہ کے بارے میں پوری تفصیل اعلام الموقعین جلد ۲ صفحہ ۷۲ تا ۸۲ میں ملے گی۔ (مترجم)

[2] بیع استصناع اس بیع کو کہتے ہیں، جو کسی چیز کے بنانے کے لیے کیجاتی ہے، (جیسے آپنے موچی کو جوتہ بنانے کا آرڈر دیا یا ایک کمپنی کو ایک خاص طرز کی موٹر یا گھڑی بنانے کا آرڈر دیا) یہ بیع عام قاعدۂ شرعی کے مطابق صحیح نہیں ہے کہ شریعت میں معدوم شے یعنی وہ چیز جو ابھی وجود میں نہ آئی ہو، اس کی بیع ناجائز ہے، لیکن تمدنی ضرورت کی وجہ سے، اجماع کے ذریعہ اس کی اجازت دے دی گئی ہے، (اصول فخر الاسلام بزدوی باب الاستحسان) (م)

بظاہر بیع معدوم کے سلسلہ میں عام قاعدہ شرعی اور اس اجماع میں تضاد معلوم ہوتا ہے، لیکن اس میں تضاد نہیں ہے، بلکہ عمومی قاعدہ سے یہ صورت اجماع کے ذریعہ مستثنیٰ کر لی گئی ہے، اور یہ

۹- اجماع قسمیں اجماع دو قسم ہوتا ہے، ایک اجماع قولی، دوسرا اجماع سکوتی۔

۱- اجماع قولی یعنی وہ اجماع جو علماء کے باہمی مشورہ اور ان کے زبانی اتفاق رائے کر لینے سے واقع ہوا ہو۔

۲- اجماع سکوتی کی صورت یہ ہے کہ کسی عالم نے کسی مسئلہ کے بارے میں کوئی رائے دی یا فتویٰ دیا، اور اس کا علم علمائے عصر کو ہوا، مگر ان کی طرف سے اس کی کوئی تائید یا مخالفت نہیں ہوئی، تو اجماع کا وقوع ہو گیا۔

پہلی صورت کی حجیت تو مسلّم ہے، لیکن اجماع سکوتی کے حجت ہونے میں اختلاف ہے،[1]

(بقیہ حاشیہ ص ۱۲۵) استثناء مجتہدین نے اس لیے کیا کہ اس عمومی قاعدہ کی موجودگی میں ہر زمانہ میں اس پر تعامل رہا ہے اور کبھی کوئی نکیر نہیں کی گئی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صورت اس کلیہ سے خارج ہے، لیکن یہ تخصیص اور اس استثناء صرف اسی صورت تک محدود رہے گا، اصول بزدوی کے شارح کہتے ہیں یتعامل الامة عن غیر نکیر وقصر والامر علی ما فیه تعامل۔ (ج ۲ ص ۱۱۲۵) بغیر کسی نکیر کے امت کا تعامل اس پر رہا ہے، اور اس کو مجتہدین نے اسی صورت تک محدود رکھا ہے جس میں تعامل ہے۔

[1] امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اجماع سکوتی کو اس صورت میں تسلیم کرتے ہیں کہ جب سکوت چند افراد کی طرف سے ہو اور زیادہ تر افراد نے اس کی موافقت کر لی ہو، اور اگر اکثریت نے موافقت کا اظہار نہیں کیا ہے تو پھر یہ سکوت معتبر نہیں ہوگا، مگر فقہائے احناف مطلقاً سکوت کو تائید پر محمول کرتے ہیں، خواہ اکثریت نے سکوت اختیار کیا ہو، یا چند افراد نے، اس میں کوئی فرق نہیں ہے (کشف الاسرار، اصول السرخسی ج ۱ ص ۳۰۲) اور ارشاد الفحول وغیرہ میں اس کی تفصیل مل سکتی ہے۔ مصنف کتاب نے اجماع سکوتی اور قولی کی اصطلاح استعمال کی ہے، قدیم فقہاء عموماً اجماع عزیمت اور اجماع رخصت کی اصطلاح بھی استعمال کرتے ہیں۔ (اصول السرخسی ج ۱ ص ۳۰۳)

اور اس کے درجہ و مرتبہ کی تعیین اور شرائط کے بارے میں بھی اختلاف ہے، عہد فاروقی تک کسی مسئلہ پر اجماع کا ہو جانا آسان تھا، کیونکہ حضرت فاروقؓ نے اپنے عہد میں تو ممتاز صحابۂ کرام کو بغیر کسی شدید ضرورت کے مدینہ سے باہر جانے سے روک دیا تھا، تاکہ جو نیا علمی و سیاسی مسئلہ پیش آئے اس میں ان سے آسانی کے ساتھ مشورہ کیا جا سکے،[1] لیکن حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت کے آخری دور میں صحابۂ کرام مختلف ملکوں اور شہروں میں پھیل گئے، اور ان کی تربیت کی وجہ سے حجاز، مصر، عراق، اور شام کے دور دراز مقامات میں بے شمار فقہاء و علماء پیدا ہو گئے۔ اس لیے اب ناممکن ہو گیا کہ ان تمام مجتہدین کی متفقہ رائے سے کسی مسئلہ میں اجماع ہو سکے، کیونکہ کسی عام علمی مشاورت کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا،[2] اور کسی ایک ملک یا کسی ایک مقام کے علماء کسی مسئلہ پر اجماع کر لیتے تو اس اجماع کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

---

[1] صحابہ کرام کے مدینہ سے باہر نہ جانے کے اور بھی مصالح تھے جن میں سے ایک یہ تھا کہ صحابہ کی ذات اور ان کی نسبت راویوں کو نئی قومیں فتنہ نہ بنا لیں، حضرت عمرؓ کے باہر نہ جانے دینے کا مقصد یہ تھا کہ صحابہ کرام مدینہ سے ترک سکونت کر کے معاش وغیرہ کے لیے دوسری جگہ بود و باش نہ اختیار کریں، ورنہ مطلقاً باہر جانے کی ممانعت نہیں تھی، بلکہ جہاد اور دوسرے دینی مقاصد کی خاطر تو حضرت عمرؓ صحابہ ہی کو ذمہ دار بنا کر روانہ فرماتے تھے، جب کوئی اہم اعلان یا اہم مشورہ کرنا ہوتا تھا تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حج کے موقع پر تمام ذمہ داروں کو بلا لیا کرتے تھے، اور وہیں مشورہ کر لیا کرتے تھے، حضرت عمرؓ کے بعد بھی یہ صورت اختیار کی جا سکتی تھی، لیکن کچھ سیاسی حالات ایسے ہو گئے تھے جس کی وجہ سے یہ امکان ختم ہو گیا تھا، مگر فی نفسہ یہ کوئی ناممکن بات نہیں تھی، اس لیے مصنف کا یہ کہنا محل نظر ہے کہ صحابہ اور علماء کے مختلف ملکوں میں ہونے کی وجہ سے عام علمی مشاورت کا کوئی امکان باقی نہیں رہ گیا تھا، ثبوت آگے آتا ہے۔

[2] تاریخ التشریع الاسلامی سبکی، سایس اور بربری، یہ حضرات ازہر کے مدرسین میں ہیں،

یہی وجہ ہے کہ ایسے تمام مسائل جن کی شرعی حیثیت صرف اجماع ہی کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے۔ ان کا تاریخی سررشتہ یا تو خلفائے راشدین کے عہد[1] سے ملتا ہے یا پھر صدر اول[2] سے۔

---

[1] مصنف نے اوپر لکھا ہے کہ عہد فاروقی کے بعد اجماع کا امکان ختم ہوگیا، اس کے بعد اب یہ کہنا کہ اجماعی مسائل کا سررشتہ عہد خلفائے راشدین سے ملتا ہے یا صدر اول سے، دونوں باتوں میں تضاد ہے۔

[2] صدر اول سے اگر مصنف کی مراد پورا عہد صحابہ ہے تو یہ بات اس لیے غلط ہے کہ عہد تابعین میں بھی بہت سے مسائل میں اجماع ہوا، مثلاً امہات اولاد کی خرید و فروخت کا مسئلہ خلفائے راشدین کے عہد میں مختلف فیہ رہا، مگر عہد تابعین میں اس پر اجماع ہوگیا یعنی اس کے جواز کا کوئی بھی قائل نہیں رہا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ائمہ اربعہ اس مسئلہ میں متفق الرائے ہیں، اگر مصنف کی مراد صدر اول سے کچھ اور ہے تو اس کی وضاحت ہونی چاہیئے،

تبع تابعین حصہ اول

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں جس طرح صحابۂ کرامؓ کے جانشین اور تربیت یافتہ تابعین عظام تھے، اور صحابۂ کرام کے بعد انہی کی زندگی ملت اسلامیہ کے لیے نمونۂ عمل ہیں، بالکل اسی طرح تابعین کرام کے جانشین اور انکے فیض یافتہ تبع تابعین تھے، سیر الصحابہ کے سلسلہ کی تکمیل کے بعد دارالمصنفین "تابعین" کے نام سے تابعین کے مقدس گروہ کے حالات کا مرقع پیش کر چکا ہے، اب اس نے ان کے بعد کے مقدس تابع بزرگوں کا مرقع تیار کیا ہے، اس کے دو حصے ہیں، پہلے حصہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے جلیل القدر تلامذہ اور انکے فقہی مسلک کے علمبردار امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی، امام زفر کے علاوہ امام اوزاعی، ابن جریج، یحییٰ بن آدم اور فضل بن عیاض وغیرہ کے سوانح اور ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی کارناموں اور مجتہدات کی تفصیل بیان کی گئی ہے،

(مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی) قیمت : [illegible]

منیجر

سوپارہ تاریخ کی روشنی میں

از جناب انور احمد صاحب سوپاروی

عہد عتیق کے بہت سے مشہور اور پُررونق مقامات آج اپنی عظمتِ رفتہ کھو چکے ہیں، اور بعض مقامات تو ہمارے علم ہی سے محو ہو چکے ہیں، قدیم ملکوں اور سلطنتوں میں مصر، عرب کا شمالی زرخیز علاقہ جسے نامور ماہر آثار پروفیسر جیمز ایچ بریسٹیڈ نے زرخیز کریسنٹ (Fertile Crescent) کا نام دیا ہے، ہندوستان، یونان، ایران اور چین میں آثار قدیمہ کے محققوں کی کوششوں سے بہت سے ویرانے اور قدیم شہروں کے کھنڈر زمین سے برآمد ہوئے ہیں، قوم عاد، ثمود، جرہم اور سبا کے متعدد پرانے شہروں کے نشانات ملے ہیں، جن کے ذریعہ عہد عتیق کی تہذیب پر روشنی پڑتی ہے، جسے اب دنیا فراموش کر چکی ہے، جس شہر کو کل عروج حاصل تھا، آج اس کا نام و نشان تک باقی نہیں ہے، بڑی بڑی عظیم الشان حکومتیں صفحۂ دہر پر ابھریں اور مٹ گئیں، آج ان کی شان و شوکت، جاہ و جلال اور سطوت و جبروت کا صرف دھندلا سا عکس تاریخ کے اوراق میں ملتا ہے، جو شہر کسی زمانہ میں مرکزی حیثیت کے مالک تھے، آج وہ یا تو بالکل ہی مٹ گئے ہیں، یا چھوٹی چھوٹی بستیوں کی شکل میں اپنے درخشاں ماضی کا سوگ منا رہے ہیں جن کی تاریخی عظمت سے خود وہاں کے باشندے بھی واقف نہیں ہیں،

ایک زمانہ میں ہندوستان علم و فن، صنعت و تجارت، اور تہذیب و تمدن میں مرکز عالم تصور کیا جاتا تھا، دوسری قومیں اس کے علوم سے خوشہ چینی کرتی تھیں، اس سے تجارت کرنے

میں آپس میں نبرد آزما ہوتی تھیں، حکومتیں اس سے سفارتی تعلقات قائم کرنے میں کوتاہی نہیں کرتی تھیں، لیکن قانون قدرت سے کسے مفر ہے، مصر، عرب، روم اور چین کی عظیم الشان حکومتیں مٹ گئیں، اور آج ان کے قدیم خوشنما اور آباد شہروں کے کھنڈر زبان خاموش سے اپنے ماضی کا افسانہ سناتے ہیں، بڑے بڑے باجبروت بادشاہوں کے فلک بوس محلات کھنڈر بن گئے، جن سے آج بھی اس عہد کے فن تعمیر کی ترقی کا پتہ چلتا ہے،

ہندوستان کے بھی بہت سے شہر تاریخ کے اوراق میں گم ہو چکے ہیں، جن میں بعض کے محض نام ہی رہ گئے ہیں، ایسے شہروں کا تعین کرنا امر دشوار ہے، تاہم آثار قدیمہ کی تحقیق کی روشنی میں ان کے بیش بہا دفینے رفتہ رفتہ منظر عام پر آرہے ہیں، سوپارہ یا شرپارک (قدیم تاریخی نام) بھی ایک ایسا ہی شہر ہے، جو حوادث زمانہ کا شکار ہو کر قعر گمنامی میں کھو گیا ہے، سوپارہ قدیم زمانہ میں ہندوستان کے مغربی ساحل کا ایک نہایت ہی مشہور اور خوبصورت شہر تھا جس کا شمار ملک کے مشہور بندرگاہوں میں ہوتا تھا، قدیم کتابوں اور سفرناموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں بھڑوچ، سورت، چوکل، کلیان، تھانہ اور کالی کٹ بھی ہندوستان کے مغربی ساحل کے مشہور بندرگاہ تھے، جن میں بھڑوچ اور سوپارہ کو فضیلت حاصل تھی، سوپارہ کا تذکرہ ہندوستان کے کئی مذہبی کتابوں اور تاریخی کتبوں میں بھی ملتا ہے، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آریہ قوم ہندوستان کے شمالی خطہ پر قابض ہو گئی تو اس کے قدیم باشندے جنوب کی جانب منتقل ہو گئے، جہاں انھوں نے چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستیں قائم کر لیں، اس کے بعد آریہ قوم نے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلنا شروع کر دیا، یہاں تک کہ آریہ اور ڈراوڈا قوم میں معاشرتی امتزاج کا آغاز ہوا، اور ہندوستان میں ایک نئی مخلوط قوم پیدا ہوئی، پھر آریہ اور ڈراوڈین نے مشترکہ مذہب اختیار کر کے باہمی ارتباط کی جڑیں اور استوار

کر دیں، غالباً اسی دور میں سوپارہ نے اپنے جغرافیائی محل وقوع کی بنا پر وہ فضیلت حاصل کر لی جس کی طرف قدیم کتابیں اور کتبے اشارہ کرتے ہیں،

اس زمانہ میں سوپارہ ساحل ہند کا ایک خوشنما اور بارونق شہر تھا، جس کی شہرت دور دور تک پھیلی ہوئی تھی، اور اس کے بندرگاہ میں غیر ملکی جہازات آیا کرتے تھے، ہندوستان کے تجارتی مال کا بیشتر حصہ اسی بندرگاہ کے ذریعے غیر ممالک پر برآمد ہوتا تھا، بیرونی ممالک کے جہازات عموماً باری گازا یا موجودہ بھڑوچ کے بندرگاہ سے ہوتے ہوئے سوپارہ آتے تھے، لیکن تاریخ اس بارہ میں ہماری اطمینان بخش رہنمائی نہیں کرتی، ہندوستان کی یہ بدنصیبی ہے کہ تاریخی سرمایہ کے اعتبار سے بہت کم مایہ ہے، اس لیے مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی تاریخ لکھنے میں بڑی دقت پیش آتی ہے، ہندوستان کے قدیم باشندوں نے تاریخ کی طرف بہت کم توجہ کی، اور اگر کسی دور میں چند تاریخی کتابیں لکھی بھی گئیں تو وہ تغیرات زمانہ کے سبب منظر عام پر نہ آسکیں، بہرحال اس زمانہ کی مذہبی کتب مثلاً وید، اپنشد، برہمن گرنتھ، رامائن، مہابھارت، پوران، سوتر، بدھمت اور جین مت کی کتابوں کی مدد سے اس دور کے طرز معاشرت، مذہبی زندگی، تجارتی حالات، فن تعمیر اور قدیم حکومتوں کا مجمل حال معلوم ہو سکتا ہے، ان کے علاوہ پرانے کھنڈروں سے بھی مدد مل سکتی ہے، اس زمانہ میں جو غیر ملکی سیاح ہندوستان میں آئے ان کے سفرناموں سے البتہ بہت کچھ مواد ملتا ہے، پھر سنگی کتبے، سکے، سنگ تراشی کے نادر نمونے، مٹی کے ظروف اور متفرق تعمیرات وغیرہ بھی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق کا کام دیتے ہیں، ایسی صورت میں کسی ایک شہر کی تاریخ اور اس کی عظمت پارینہ کو روشنی میں لانا نہایت دشوار اور مشکل کام ہے۔

سوپارہ ضلع تھانہ (علاقہ کوکن) کا ایک گاؤں ہے، جو بمبئی شہر سے ۳۰ میل دور دیسٹرن

ریلوے لائن کے مغرب میں ایک میل کی مسافت پر واقع ہے، مہابھارت میں کوکن کی جگہ ایرانت کا ذکر ملتا ہے، مندرجہ ذیل عبارت میں سوپارہ یا شرپارک کا خاص ذکر ہے :-

ततः शूर्पारक देश सागर स्तस्त निर्नमे
सहस जामद ग्नस्त्र सोड परान्त महीतलम

(ترجمہ) شرپارک دیش سمندر سے نمودار ہوا ہے، جسے رشی جامدگنی نے آسانی سمندر سے برآمد کیا۔

اس کی وضاحت اس طرح کیجاتی ہے کہ ہندوؤں کی ایک مذہبی روایت کے مطابق جب رشی کی ماں کا انتقال ہوا تو اس کی چتا کے لیے اسے ایک ایسے قطعۂ زمین کی ضرورت پڑی جہاں انسانوں کے قدم نہ پہنچ سکے ہوں، لوگوں نے پوچھا، ایسی زمین کہاں مل سکتی ہے، اس نے کہا میں سمندر سے زمین لوں گا، چنانچہ اس نے جیلوں (رتناگیری) کے مندر کے صدر دروازے سے ایک بڑا تیر پھینکا، جو سوپارہ کے قریب کلم کے مقام پر جاکر گرا، اس تیر میں یہ تاثیر تھی کہ اس علاقہ کا پانی ہٹ گیا اور سمندر سے زمین ابھر آئی، جسے شرپارک کہنے لگے، یہیں اس نے اپنی ماں کی چتا جلائی، اسی زمانہ سے یہ مقام پوتر اور تیرتھ گاہ بن گیا،

مہابھارت کا ایرانت (کوکن) موجودہ شمالی کوکن بناوسی اور گومنتک پر مشتمل تھا، مورخین کا خیال ہے کہ آرین قوم نے ۱۷۰۰ء ق م سے ۱۶۰۰ء ق م میں ایرانت میں مستقل طور پر سکونت اختیار کرلی تھی، اور اپنی چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنالی تھیں، حضرت مسیح کی پیدائش کے زمانہ تک کوکن کا کہیں ذکر نہیں ملتا، غالباً پانچویں یا چھٹی صدی میں ایرانت کو ایک نیا نام ملا، جسے آج ہم کوکن کہتے ہیں، دیوان بہادر ڈاکٹر ایس، کرشن سوامی آئینگر اپنی کتاب
Ancient India & South India History & Culture

میں لفظ کوکن پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کوکن درحقیقت لفظ کونگو (Congu) سے بنا ہے، تامل زبان میں اسے کون کانم (Kon-Kanam) کہتے ہیں، کانم تامل زبان میں جنگل کو کہتے ہیں، یعنی وہ علاقہ جو جنگلات پر مشتمل ہو، پرنانورو (Purananuru) کی نظم میں اسی علاقہ کو کون پیرو کانم کہا گیا ہے (ص ۲۷۶)۔ غالباً یہی نام بگڑ کر کوکن بن گیا، سنسکرت میں اسے کوکنم کہتے ہیں، سوپارہ سے قریب بحیرۂ عرب میں ایک چھوٹا سا ٹاپو ہے، جسے کلم کہتے ہیں، کسی زمانہ میں یہاں جنگل رہا ہوگا، اس لیے اسے کانم کہتے ہوں گے، مگر اب وہاں ماہی گیروں کی آبادی ہے، اکثر عرب سیاحوں نے ان کو کمکم، الکمکی اور کنکن لکھا ہے، اور ابن خرداذبہ (متوفی ۲۵۶ھ) نے کمکم کنکن سے موسوم کیا ہے، اپنی کتاب "المسالک والممالک" میں لکھتے ہیں:

واعظم ملوک الهند بلهرا و	راجہ بلہرا ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ ہے
تفسیرہ ملوک الملوک ونقش	اسکی انگوٹھی پر یہ عبارت منقش ہے کہ جو کوئی تم
خاتمه من ودک لا امرولی مع	کسی غرض و مفاد کی خاطر محبت کرے وہ اسکی
انقطاعه وینزل الکمکمہ	تکمیل کے بعد ہی تم سے کنارہ کشی اختیار کرلیگا
بلاد الساج (ص ۶۷)	اور یہ راجہ ساگوان کے دیس کمکم میں آباد رہتا ہے۔

مشہور مسلمان مورخ اور سیاح ابوحسین علی بن حسین (متوفی ۳۴۶ھ) اپنی کتاب "مروج الذہب" میں رقمطراز ہے :-

وتلیعی بلادہ الکمکم" (ص ۱۱۱۰)	اور بلہرا کا ملک کمکم ہے۔

ابن رستہ نے اسے کمکم لکھا ہے، بطلیموس (Ptolemy) کا "ساوپارا"، پیری پلس کا "سپارا" اور "اوپارا" قدیم سنگی کتبوں کا 'شوپارکا' یا 'شوپارگا' مہابھارت کا 'شرپارک دیشا' بائبل کا 'اوفر' (Ophir)، مہاوسہ کا 'سپارکا' ٹم، اور پالی ادب کا 'سوپارکا' ....

سب ایک ہی ہیں، یہ مقام ایک تیرتھ گاہ، خوشنما شہر اور بہترین بندرگاہ کی حیثیت سے مشہور تھا،
خصوصاً ساتواہن عہد (Satuahan Period) میں وہ جنوبی ہند کا اہم ترین شہر
شمار کیا جاتا تھا، جہاں سے مور، بندر، موتی، صندل، مچھلی، سپاری، عمارتی لکڑی، کپڑا، ہاتھی دانت
ناریل، بانس، پھل اور جوتے غیر ممالک کو برآمد ہوتے تھے،

حدود اربعہ | سوپارہ بحر عرب سے تین میل دور آباد ہے، مشرق میں ویسٹرن ریلوے لائن اور
کوہستانی سلسلہ ہے، مغرب میں بحر عرب کا نیلا پانی موجزن ہے، جنوب میں بسین شہر اور الہاس
ندی کا دہانہ ہے اور شمال میں ویترنا ندی ناسک سے ہوتی ہوئی بحر عرب میں ادنالہ کے قریب
آگرگرتی ہے،

وجہ تسمیہ | اس کا پتہ نہیں کہ اس بستی کا نام شرپارک کیسے اور کب پڑا، نامور مورخ لاسین
(Lassen) کی تحقیق ہے کہ سوپارہ سنسکرت لفظ "سوپارک" بمعنی بہترین بندرگاہ
کی مسخ شدہ شکل ہے، اس سلسلہ میں جارل کارپنٹیر اور براز، اے، فرنانڈیز نے مہابھارت
کی یہ روایت ایشیاٹک سوسائٹی جرنل (۱۹۲۷ء) میں نقل کی ہے:-

بحر عرب عہد عتیق میں مغربی گھاٹ تک پھیلا ہوا تھا، جس وقت پرشو رام کو چند مندر
تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی تو وہ نئی جگہ کی تلاش میں سمندر کے دیوتا (ورونا) کی طرف
متوجہ ہوا، مگر ورونا نے سمندر سے زمین دینے سے صاف انکار کر دیا، اس کے انکار پر
پرشو رام اپنی قوت آزمانے کے لیے پہاڑ کی ایک بلند چوٹی پر پہنچا، اور وہاں سے ایک
طلسماتی "سوپ" سمندر کی جانب پھینکا، جس کی تاثیر سے سمندر کا پانی سمٹنا شروع ہوا،
اسی اثنا میں ورونا سفید چیونٹی کے قالب میں منتقل ہو گیا اور اس "سوپ" کو کھا گیا،
اس کے بعد پرشو رام نے وہاں سے مسلسل ۲۱ تیر پھینکے، جن کے اثر سے پانی ہٹ گیا اور

زمین نمودار ہو گئی، جسے "پرشو رام شتر" کہنے لگے، جہاں اس نے ۱۰۸ مندر تعمیر کرائے،
اور برہمنوں کو لا کر بسایا، اس علاقہ کو بعد میں کوکن یا اپرانت کہنے لگے، اور اس کا
دار الحکومت سوپارہ (سوپ پارہ) مقرر ہوا،"

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ 'شور' کے معنی بہادر کے ہیں، اس نسبت سے اس شہر کا
نام بہادروں کی بستی یا 'شورپارک' رکھا گیا ہو، یہاں کے لوگوں کو اس لیے بہادر سمجھا جاتا تھا
کہ اس وقت سوپارہ کے چاروں طرف پانی ہی پانی تھا، مغرب میں سمندر تھا اور سوپارہ کی
بندرگاہ کا رخ مشرق کی طرف تھا، جہاں ویترنا ندی اور الہاس ندی کا پانی آکر اس طرح
مل جاتا تھا کہ سوپارہ ایک جزیرہ بن جاتا تھا، اس زمانہ میں سمندر میں سفر کرنے والوں اور اس کے
ساحل پر رہنے والوں کو عام طور پر بہادر اور نڈر سمجھا جاتا تھا، اس لیے لاسین کی رائے ہی مستند
اور قابل اعتماد ہے،

ہندوستان کے قدیم مذہبی ادب خصوصاً مہابھارت میں شوپارک کا تذکرہ بہ تفصیل نظر آتا
ہے جو ۱۴۰۰ ق م کی تصنیف ہے، مثلاً

"..... پھر شورپارک فتح کر لیا گیا ——— ..
یہ جامد گنی کی قیام گاہ ہے جو رام تیرتھ میں غسل کرتا ہے، سمندر نے اس رشی کو شورپارک
کی سرزمین عطا کی جو زمین کا مغربی سرا ہے۔
وہ شورپارک اور نربدا کے پاک پانی میں غسل کر کے پندرہ دنوں تک روزہ رکھے
"شہزادہ" بن جائیگا۔"

بدھ مت کے ظہور اور اشاعت سے قبل سوپارہ ہندو مت کا مرکز تھا، یہاں ایک رام کنڈ
بھی ہے جو اس کی تیرتھ گاہ ہونے کا ایک ثبوت ہے، ہندوؤں کی مذہبی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ

سوپارہ بڑے بڑے راجاؤں کی راجدھانی رہا ہے، بدھ مت کی کتابوں میں بھی سوپارہ کا ذکر جا بجا ملتا ہے، ان گنت صدیاں بیت جانے کے بعد بھی یہاں کے کئی مقامات آثار قدیمہ کے لحاظ سے قابل توجہ ہیں،

انیسویں صدی کے آخری سالوں میں سابق حکومت بمبئی نے سوپارہ کی جانب توجہ کی، اس میں ایشیاٹک سوسائٹی کے ڈاکٹر داجی کا بڑا ہاتھ تھا، ان کو آرکیولوجی سے بہت لگاؤ تھا، چنانچہ انھوں نے جوناگڈھ کے مشہور و معروف ماہر کتبات و آثار قدیمہ پنڈت بھگوان لال اندراجی کو بمبئی بلا کر سوپارہ اور مہاراشٹر کے تاریخی مقامات کا تحقیقی معائنہ ان کے سپرد کیا، پنڈت بھگوان لال، مشہور انگریز آرکیولوجسٹ مسٹر کیمپ بل (Mr. Camp bell) کی معیت میں، فروری ۱۸۸۲ء کو سوپارہ آئے، اور سوپارہ اور اس کے اطراف و جوانب کا معائنہ کرنے کے بعد سوپارہ کے استوپ کی کھدائی کا کام شروع کیا، اس استوپ کو مقامی باشندے "بورو ڈ راجہ کا کوٹ" کہتے ہیں، اس کھدائی میں انھیں ایک سنگی صندوق ملا جس میں گوتم کی مورتیاں اور ان کے کشکول کے ٹکڑے تھے، اسی دوران میں ایک سنگی کتبہ بھی ملا، جو شہنشاہ اشوک کی یادگار ہے، اس پتھر پر دس سطریں تحریر تھیں، پہلی چار سطریں مٹ چکی تھیں، باقی برہمی رسم الخط میں تھیں،

جرمنی کے ماہر آثار قدیمہ ہند ڈاکٹر ای، ہل اِش (Dr. E. Hul zsch) کے بیان کے مطابق سوپارہ کے قرب و جوار میں اشوک کے ۱۴ سنگی کتبے زمین دوز ہو چکے ہیں، جو تلاش و تحقیق سے مل سکتے ہیں، اس کی تصدیق ۱۹۵۶ء میں دریافت شدہ ایک اہم کتبہ سے ہو گئی، جو سوپارہ کے قریب بھوئی گاؤں میں ملا، ان کتبوں کا ترجمہ حسب ذیل ہے:-

"...... بادشاہ دیونام پریہ، پریہ درشن .... انسان خوشی اور

غمی کے موقعوں پر بے شمار رسوات کا مظاہرہ کرتا ہے، بیماری، بچوں کی شادی، بچے کی ولادت یا سفر پر روانہ ہوتے وقت مختلف رسموں کی ادائیگی ہوتی ہے...... یہ رسوات بلاشبہ بے فائدہ اور بے نتیجہ ہوتے ہیں...... البتہ یہ اعمال ثمرآور اور صالح ہیں:

غلاموں سے نیک برتاؤ، بڑوں کی عزت، جانوروں کے ساتھ ہمدردی اور برہمن کے ساتھ فراخدلی، یہ اعلیٰ کردار کی نشانیاں ہیں، اس لیے ایک باپ یا ایک بیٹا ....

(باقی عبارت مٹ چکی ہے)

کھدائی کے دوران میں استوپ کی شکل و صورت متغیر ہو گئی ہے، جگہ جگہ سے مسمار ہو گیا ہے، دوسری بار مسٹر ایچ، کیو، منیر نے سوناربھاٹ میں کھدائی کی، اس کھدائی میں ایک قدیم مندر کی بنیاد کا پتہ چلا، جو رام کنڈ اور سیتا تالاب کے قریب واقع ہے، اسی جگہ ایک دیدہ زیب مورتی (یوگ ندرا دیوی) اور تمری مورتی ملی، جو سنگ تراشی کا نہایت عمدہ نمونہ ہیں، یوگ ندرا مورتی کے جسم کے زیورات سے اس دور کے لوگوں کے جمالیاتی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے، یہ دونوں مورتیاں فی الحال چکلیشور مندر میں رکھی ہوئی ہیں،

حکومت ہند کے محکمۂ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر برائے ریاست مہاراشٹر شری پی، ایم، جوشی اور ماہر آثار قدیمہ شری ڈی، بی، چٹلے کے زیر قیادت مارچ، اپریل ۱۹۵۶ء میں بندر کے مقام پر کھدائی کی گئی، یہ زمین ایک کسان غلام مصطفیٰ نوقت کی ملکیت ہے، اس سے پیشتر اسی جگہ کنواں کھودا جارہا تھا تو زنگ ولیز میں استعمال شدہ بڑے بڑے ظروف ملے تھے، اس لیے شری چٹلے نے بھی یہی جگہ منتخب کی، اتفاق سے انھیں ایک سالم دائرہ نما کنواں (Rig well) ملا جو ماہرین کے اندازے میں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پرانا ہے، اس قسم کے کنویں خاندان آندھرا کے

ابتدائی دورِ حکومت میں بنائے گئے تھے، رنگ ویلز کی تہ سے مٹی کے ظروف، چند سکے، موٹی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی ملے، ظروف کا معائنہ کرنے کے بعد ان میں سے بعض غیر ملکی (رومن) ثابت ہوئے، جو اس کا ثبوت ہے کہ مغربی ایشیا کے ممالک سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات نہایت ہی قدیم ہیں، ابھی چند سال پیشتر یہاں ایک بڑا کنواں کھودا جا رہا تھا، کہ دس فٹ کی گہرائی میں مزدوروں نے دیوار کی ایک چوکھٹ دیکھی، معلوم ہوا کہ درحقیقت یہ چوکھٹ کسی قدیم کنویں کا بالائی حصہ ہے جو جغرافیائی تغیرات کی نذر ہوگیا، یہ کنواں کافی گہرا اور اب تک سالم حالت میں ہے۔

سوپارہ کا ذکر مہاراشٹر کی قدیم گپھاؤں کے سنگی کتبوں میں بھی ملتا ہے، کنہری (شہر بمبئی کے شمال میں ۲۰ میل دور) میں سوپارہ کے ایک سوداگر سیمیکا (Semika) اور ایک جوہری کا ذکر کندہ ہے۔ اسی کے ساتھ "ساگر پالو گانامز" لوگوں کا تذکرہ بھی ہے، جو سمندری سفر کیا کرتے تھے، ان کی آبادی سوپارہ اور شہر کلیان میں بکثرت تھی، ناسک کے سنگی کتبوں میں بھی اس کا ذکر ہے؛ ایک تختی نہپانہ راجہ کے داماد یا ونک کے لڑکے نے تیار کرائی تھی، اس تاریخی تختی کا اقتباس حسبِ ذیل ہے:

...... بھڑ وچ، سوپارہ اور دشی پور کے علاقوں میں بادشاہ نے کنویں، تالاب کھدوائے باغات لگوائے اور چرک طبقہ (وید لوگ) کے نان گول گاؤں کے لیے ۳۲ ہزار ناریل کے درخت تحفہ میں دیے۔" ("پراچین مہاراشٹر" ڈاکٹر کیتکر [مرہٹی]

محکمۂ آثار قدیمۂ ہند نے جو تاریخی کتبے جمع کیے ہیں، ان میں ناسک کے غار کا ایک کتبہ ہے، جس میں سوپارہ کو شور پارگا لکھا ہے، یہ غار ۱۰۰ ق م میں تعمیر کیا گیا تھا، اس کے علاوہ کارلے (کارلا) کے غار میں سوپارہ کے ایک سوداگر کے قیمتی تحائف کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔

کتاب "مہاومہ" میں سوپارہ کو "سوپارتپنا" لکھا ہے، بوہلر (Buhler) نے جاتک کے حوالے سے سوپارک کو ہندوستان کی قدیم ترین بندرگاہ بتلایا ہے، بدھ مت کی ایک قدیم کتاب "پورانترا" میں اس شہر کے بارہ میں لکھا ہے کہ سوپارہ راجہ پُرن کی قیام گاہ ہے جس نے کئی سمندری سفر کیے تھے، "پُرن" سوپارہ کے ایک ممتاز اور متمول سوداگر کا بیٹا تھا، اس کی ماں ایک زر خرید کنیز تھی، پرن اپنی قابلیت اور ذہانت اور بہادری کے زور سے راجہ بن گیا، وہ سمندری سفر کا بڑا شائق تھا، ایک مرتبہ بنارس کے چند تاجروں کی معیت میں سفر کر رہا تھا، دوران سفر میں بنارسی تاجر گوتم بدھ کی تعلیمات کو پُر اثر انداز میں پڑھتے جاتے تھے، اس کا پرن کے دل پر بڑا اثر ہوا، چنانچہ وہ سوپارہ آنے کے بعد دولت، گھر بار وغیرہ کو چھوڑ کر بنارس چلا گیا اور بدھ مت اختیار کر لیا،

برنوف (Burnouf) نے "پرن کی کہانیوں (Legend of Purn) کے ترجمے میں لکھا ہے کہ "سوپارہ ایک بادشاہ کی قیام گاہ تھا، شہر کی آبادی کئی ہزار افراد پر مشتمل تھی، شہر میں داخل ہونے کے لیے اٹھارہ دروازے تھے، اور یہاں سونے کا سکہ رائج تھا، شہر کے سوداگر نہایت آسودہ حال اور دولت مند تھے۔" (براز، اے، فرنانڈیز)

بدھ مت کی مذہبی روایات کے مطابق گوتم بدھ نے اپنے کسی اگلے جنم میں سوپارہ کا سفر کیا تھا، اور یہاں کے دو ناگ بادشاہ (کرشن اور گوتم) کو اپنی تعلیمات سے مستفیض کیا تھا، گوتم بدھ نے سوپارہ کی ایک ٹیکری (بربہاڈ ڈنگری) پر قیام کیا تھا، جہاں نتو بیواؤں کا ایک آشرم تھا، اس روایت کی یادگار میں یہاں ایک استوپ تعمیر کیا گیا تھا، مگر اب اسکے نشانات نہیں ملتے، ہاں منقش پتھروں کے ٹکڑے بکثرت ہیں اور ایک دوسری روایت کے مطابق پرن مترایانی پتر نے گوتم بدھ کیلئے یہاں ایک وہار اور استوپ تعمیر کرایا تھا،

گوتم بدھ کے انتقال کے بعد بدھ مت کئی فرقوں میں منقسم ہوگیا، ان میں دو فرقے مقبول عام ہوئے، ایک فرقہ بت پرستی کا حامی بنا جو ہندو ازم کی اساس ہے، بدھ مت دوسری یا تیسری صدی عیسوی تک ہندوستان کا مقبول ترین مذہب رہا ہے، تاریخی کتبے اس بات کی شہادت دیتے ہیں کہ

بدھ مت کے ایک فرقہ "بھاد ائے نیا" کے افراد ناسک شہر اور کنہری میں بکثرت تھے، اور دھاتو فرقہ سوپارہ اور جونر میں سکونت پذیر تھا، اور بھاسا نگھی، کارلہ میں پھیلے ہوئے تھے، کتاب مہا ومہ، اور ناگر جونی کونڈا، کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اپرانت جس کا پایۂ تخت سوپارہ تھا، دھام رکھشا مشن کے ذریعہ بدھ مت کا حلقہ بگوش ہوگیا تھا، یہ مشن تیسری کونسل (۲۴۴ق م) کے بعد روانہ کیا گیا تھا، بیل کھارا اور کونھاپور کے غاروں سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی دکن بہت جلد بدھ مت سے متاثر ہوا، اسی طرح کارلہ کے مشہور غاروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ پہلی یا دوسری صدی عیسوی میں یہ علاقے بدھ مت کے حلقہ میں آچکے تھے، مگر اب اس علاقے میں بدھ مت کے ماننے والے نظر نہیں آتے۔

تیسری کونسل کے بعد اشوک اعظم نے اپرانت میں دھام رکھیتا کی سرکردگی میں ایک مذہبی مشن روانہ کیا تھا (بحوالہ سنگی فرمان نمبر ۹ اور نمبر ۱۳) جس نے سوپارہ میں بدھ مت کا پرچار کرکے اس کی کثیر آبادی کو نئے مذہب میں داخل کرلیا تھا۔ دھام رکھیتا ایک یاون یعنی غیر ہندوستانی باشندہ تھا، وہ اس علاقہ کے ستر ہزار افراد کو بدھ مت کا حلقہ بگوش بنانے میں کامیاب ہوا تھا، (مہا ومہ) اس نے اپنے مذہبی مشن کی تبلیغ و ترویج کے لیے سوپارہ کو اپنا مرکز بنایا تھا، جہاں بتدریج بدھ مت کی تعلیمات جنوب و مغربی ہندوستان میں پھیلتی گئیں، غالباً اسی زمانہ میں گجرات پر ایک یاون (غیر ملکی) بادشاہ حکمراں تھا، اس دور میں اپرانت شمال میں نوساری اور جنوب میں گوکارنہ کے ساحلی علاقہ پر مشتمل تھا، اس سے قبل اجن نے سوپارہ کی سیاحت کی تھی اور یہیں سے جہاز کے ذریعہ گجرات چلا گیا تھا۔ (مہابھارت)

گو ہم کو "پرانوں" کے بیانات کی مبالغہ آرائی سے متاثر نہیں ہونا چاہیے، تاہم ان تقریحات سے چند اہم باتیں واضح ہوجاتی ہیں کوکن کی تاریخ کا سلسلہ ۳۲۵ق م سے شروع ہوتا ہے،

اور غالباً یہی وہ زمانہ تھا جب شہنشاہ اشوک نے اپنے سنگی فرمان سرزمین سوپارہ میں نصب کیے تھے، مہابھارت (ون پرو) میں ایک جگہ تحریر ہے کہ نہایت قدیم زمانہ میں سوپارہ سے متصل ایک جنگل تھا، یہاں لوگ دیوتاؤں کے چبوتروں میں قربانیاں دیا کرتے تھے جس میں دور دراز علاقوں کے لوگ شامل ہوا کرتے تھے، وہاں چھوٹے چھوٹے متفرق مندر بھی تعمیر کیے گئے تھے، ان میں واسو، ماروتی، اندر، وشنو، اوربیتہ وغیرہ کی مورتیاں تھیں" اس جگہ کا کوئی نام نہیں دیا گیا، تاہم گمان ہوتا ہے کہ یہ وہی جنگل ہے جہاں اب نرمل (Nirmal) کی بستی آباد ہے، نرمل میں ہر سال آج بھی یاترا ہوا کرتی ہے، جس میں دور دور سے لوگ شرکت کرتے ہیں، یہاں ایک قدیم مندر بھی ہے، جہاں ودیہ شنکر بھارتی کی سمادھی ہے، اور چار دوسرے چھوٹے چھوٹے مندر ہیں، بڑے مندر کے مشرق میں تاریخی برہماڈونگری واقع ہے، جس پر ۱۳۲۳ء میں عیسائی راہب فرائر جورڈانس (Friar Jordanus) نے قیام کیا تھا، فرائر اور اس کے چار ساتھیوں نے تھانہ میں عیسائیت کی تبلیغ کرنے کی کوشش کی تھی، جس پر وہاں کے مسلمانوں سے جھگڑا ہوگیا، اور اس کے چار ساتھی مارے گئے، فرائر ان چاروں کی لاشیں لیکر سوپارہ آیا اور اس ٹیکری کے اطراف میں دفن کرکے وہاں سے کھمبایت چلا گیا۔

(IBRAS سنہ ۸۲-۱۸۸۱ء جلد ۱۵)

(باقی)

تاریخ سندھ

اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر حالات اور اسلامی فتوحات، خلافتِ راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، انکی پوری تاریخ اور ان تمام دور کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو کام انجام پائے ان سب کی پوری تفصیل ہے۔

قیمت: — روپے

منیجر

آثار علمیہ و ادبیہ

مکاتیب مولانا مناظر احسن گیلانیؒ

بنام

مولانا سید سلیمان ندویؒ

مولانا مناظر احسن صاحب کے مکاتیب کا جو سلسلہ چل رہا ہے اس کے کچھ خطوط بعد میں ملے، جو اس نمبر میں شائع کیے جا رہے ہیں، اس لیے ان میں تاریخ کی ترتیب قائم نہیں رہ سکی۔ م

۱۷ر دسمبر ۱۹۴۶ء
حیدر آباد دکن

سیدی افرغ اللہ علینا و علیکم صبراً جمیلا السّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ جو کچھ گذر چکا وہ گذر ہی چکا، لیکن اب آئندہ کیا ہوگا، جانے والے تو انشاء اللہ جنت الفردوس میں پہنچ گئے لیکن جو رہ گئے ہیں ان کے لیے تو بہار "تہا دِ نار" بنا دیا گیا ہے، اور فقیر تو خصوصی طور پر ایک ایسے وقت میں ان حالات سے دوچار ہوا ہے کہ دماغ معطل سا ہو جاتا ہے، جہاں پیدا کیا گیا تھا، یہی خیال تھا کہ وہیں سے اٹھایا بھی جاؤں، اس لیے حیدرآباد سے دل کو کبھی نہیں لگایا، لیکن جب آزادی کے دن قریب آئے تو آشیانے پر بجلی گر پڑی،

بار بار جی چاہتا تھا کہ آپ کو خط لکھوں، لیکن کیا لکھوں، حیدرآباد کی حالت یہ ہے کہ بہار میں جو کچھ ہو چکا یہاں کا آسمان خدا نہ کرے ان ہی کی دھمکیاں دے رہا ہے، فاین المفر

کل ایک صاحب آپ کی ریاست سے آئے ہیں، معلوم ہوا کہ وہاں کی حکومت مہاجرین کے لیے کچھ نظم کرنا چاہتی ہے، بعضوں کو کچھ آسانیاں بہم پہنچائی بھی گئی ہیں، آپ کا اب کیا ارادہ ہے؟ انصح لکل مسلم ہو سکے، تو کسی نیک مشورے سے سرفراز فرمایئے،

یہ عجیب اتفاق کی بات تھی کہ خلاف معمول گرمیوں کی تعطیل کے بعد جب گیلانی سے چلنے لگا تو گھر کے لوگوں کو زور دے کر حیدرآباد چلنے پر مجبور کیا، ان کو حیدرآباد سے کبھی دلچسپی پیدا نہیں ہوئی، اسی لیے میں نے کبھی زیادہ زور یہاں آنے پر نہیں دیا تھا، لیکن اس دفعہ کچھ اندرونی تقاضا ہی یہ ہوا کہ ساتھ لیتا چلوں، میرا لڑکا پٹنہ سے اچانک فساد کے پھوٹ پڑنے سے ایک ہفتہ پہلے حیدرآباد پہنچ گیا تھا، گویا ذاتی حد تک حق تعالیٰ نے میرے خاندان کو میرے پاس پہنچا دیا تھا، لیکن بیچارا مکارم پھنس گیا، خدا کا شکر ہے کہ گیلانی پر حملہ نہیں ہوا، اس وقت اپنے بال بچوں کے ساتھ وہ استھاواں منتقل ہو گیا ہے، گیلانی میں کوئی نہیں ہے، میں حیران ہوں کہ اب کیا کروں، پڑھنے کا حرج چونکہ ہو رہا تھا، اس لیے محی الدین میرا بچہ پٹنہ چلا گیا، خطوط اس کے آتے رہتے ہیں، مایوسیوں سے لبریز رہتے ہیں، کوئی تجویز آپ کے دماغ میں ہو تو اس سے مطلع فرمایئے گا،

عین وقت پر میری کشتی منجدھار میں پھنس گئی ہے، سارا کیا کرایا معلوم ہوتا ہے صفر ہو گیا، وبفضل اللہ انشاء و بکلم مایرید، کیا سوچتا رہا اور کیا ہوا،

محتاج دعا و توجہ خاص

مناظر احسن گیلانی

۳۱ر جنوری ۱۹۴۶ء

سیدی و سید المسلمین رزقنا اللہ وایاکم العافیۃ فی الدنیا والآخرہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ توجہ فرمائی کا شکریہ، افتخار میاں سلمہٗ کے نام آپ کے شفاعت نامہ

کو بھیجا ہے، بہار کے حالات سنتے سنتے کلیجہ پک گیا الم تر الی الذین خرجوا من دیارہم وھم اُلوف
حذر الموت۔ "ھم الوف" کے الفاظ نے ہمیشہ اس تفسیر کے سمجھنے سے رکاوٹ پیدا کی، جو عموماً کتابوں
میں ملتی ہے، اور تقریباً ایک سال سے یہی خیال سامنے آرہا تھا، جسے اب دیکھ رہا ہوں" فقال لہم اللہ
موتوا" کاش! مرنے پر یہ لوگ آمادہ ہو جاتے، تو "فاحیاہم" کا وعدہ ان کے سامنے آتا، لیکن وہ
زندگی کو موت کے گڑھوں میں تلاش کرنے کے لیے جارہے ہیں، اللہ ہم لوگوں پر رحم کرے، بہار
کا حال تھا بھی زمانے سے اس کا مستحق، جسے اب اپنے سامنے دہ پا رہا ہے۔

مگر اب یہ "گیلانی" کی دُم کا کیا کروں، بہ ظاہر لنڈھے ہو کر جینے کا وقت تو باقی نہیں رہا،
شاید کہیں ادھر ادھر مرنا پڑے گا۔ دکن میں؟ لیکن دکن بھی کب تک؟ ہو سکے تو کوئی مشورہ دیجئے،
ورنہ کم از کم دعا کیجئے، اچانک زندگی کی ایک ایسی منزل پر پہنچ گیا ہوں کہ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی
نظر آرہی ہے۔ سنا آپ نے بعض لوگ بھاولپور سے دعوت دے رہے ہیں، بغداد جدید میں اس گیلانی کے
فقیر کو بسنے پر آمادہ کر رہے ہیں، سنا ہے کہ کوئی جامعہ عباسیہ وہاں ہے، آپ کے معلومات وہاں کے متعلق
کیا ہیں؟ برادرم عاصم صاحب کا کیا ہوا، ان ہی کے لیے تو عدالت میں شاید کوشش ہو رہی تھی، میرا سلام
فرما دیجئے، میاں ہاشم نے مجھ سے بالکلیہ انقطاع کلی کر لیا ہے، جو کچھ ہو سکا کرتا رہا، لیکن افسوس ہے
کہ اپنے معاملات کو وہی الجھا رہے ہیں، اللہ رحم کرے، مجلہ کا نام "دانش" مجھے بھی پسند ہے، اس سے
بہتر لفظ اب تک دماغ میں نہیں آیا، دیوانوں کے لیے "دانش" میں کیا گنجائش ہے؟ معارف والے
مضمون متعلق "ربوا" پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے ہیں، میرے ایک قدیم رفیق فی الاستاذیت کے
صاحبزادے ترجمان القرآن کے میدان میں اترے ہیں، خیر وہ تو ابھی نو آموز ہیں، اور غالباً فقیہ النفس
نہیں معلوم ہوتے، لیکن تعجب مجھے مولانا ظفر احمد صاحب پر ہے، میں نے سوچ لیا ہے کہ اب کچھ نہ لکھوں گا،
آپ کو اور مولوی شفیع دیوبندی کو "حکم" بنانا قبول کرتا ہوں، آپ منظور فرمائیں گے، میں آپکے رجحانات

سے واقف ہوں، لیکن اس کے ساتھ اس کا بھی اعتماد ہے کہ "اعدلوا" پر قیام کی آپ ہی جیسے حضرات
سے توقع کی جاسکتی ہے، فقط والسلام

مناظر احسن گیلانی

کئی روز ہوئے "الخائن" سے ملاقات ہوئی تھی، بڑی دھمکیاں حیات شبلی کے متعلق دے رہے
تھے کہ مواد تیار کیا ہے، کہتے ہیں کہ جوہری بم ہے "ہوش تھا" اعظم گڈھ کا پتہ بھی نہ رہے گا

ہر کس بخیالِ خویش خبطے دارد

۱۶ر فروری ۱۹۴۷ء
حیدر آباد دکن

سیدی! وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اس قدر جلد نقد جواب کی توقع نہ تھی، جزاکم اللہ عنا خیر الجزاء، بہار کے مسلمانوں کے سامنے کوئی
دینی یا دنیوی نصب العین ادھر چند دنوں سے باقی نہ رہا تھا، قریب قریب بے مقصد زندگی گذار رہے
تھے، زیادہ سے زیادہ توالد وتناسل بقاء نوعی کے لیے اور اجل مسمی تک پہنچنے کے لیے بقائے شخصی کے لیے
جن مقدات اور اسباب کی ضرورت ہو سکتی ہے، یہی ایک حیوانی مشغلہ ان کے سامنے رہ گیا تھا، وہ
آج شاکی ہیں کہ غیروں نے ان کی مسجدوں کو ویران کیا، لیکن میں گواہی دیتا ہوں کہ اس سے پہلے برسوں
سے وہ خود اپنے ہاتھوں اپنی مسجدوں کو ویران کر چکے تھے، لا ایمان لمن لا امانۃ لہ وان
صام وان صلّی" لیکن ان میں امانت کے ساتھ ساتھ ان صام وصلّی کا ذوق بھی ختم ہو چکا تھا، ان
بہاریوں میں سچ پوچھیے تو ایک خود میں بھی ہوں، دیکھئے دین کا افلاس دنیا میں بھی افلاس کے کس نقطۂ
انجماد تک ہم لوگوں کو پہنچاتا ہے۔ اللھم انی اعوذ بک من غضبک۔ آپ کو تقی صاحب کا
حال معلوم ہوا ہو گا، بڑا مفصل قصہ ہے، خلاصہ یہ ہے کہ یہاں بھی ان کے ساتھ وہی صورت پیش آئی
جو بہار میں پیش آئی تھی، حالات ایسے ہیں کہ توسیع کی توقع خود مجھے بھی نہیں ہے، میرا ارادہ اب ملازمت

کے جھنجھٹوں میں مبتلا ہونے کا نہ تھا، لیکن موجودہ حالات ایسے ہیں کہ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے، بہاولپور کے
خیال کو آپ کے خط کے بعد میں نے اٹھا دیا، اب جو آپ حضرات کا حکم ہوگا، اس وقت تو میں بے در اور
بے گھر ہو رہا ہوں، گیلانی کو وہاں کے مسلمان باشندوں نے قطعی طور پر چھوڑ دیا ہے، بعض خبریں
ادھر ایسی آرہی ہیں کہ دینہ کے بزرگوں کے پائے استقامت میں بھی تزلزل لا فعل اللہ پیدا ہوگیا ہے،
خداوند تعالیٰ ہم لوگوں کی دستگیری فرمائے۔ المتوسل بذیلکم فی الدنیا والآخرۃ

مناظر احسن گیلانی

مسلم یونیورسٹی سے بعض سلسلہ جنبانیاں ہوئی ہیں، معاملہ آپ ہی کے سپرد کرتا ہوں،

۹ر فروری ۱۹۴۸ء
حیدرآباد دکن

سیدی المحترم متعنا اللہ بطول حیاتکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ مجھے تعجب تھا کہ جواب میں خلاف دستور تاخیر کیوں ہوئی،
لیکن اب معلوم ہوا کہ مرحوم بہار کو سعادت اندوزی کا موقعہ دیا گیا تھا، گو یہ دنیا بہرحال چھوٹنے والی
ہے، لیکن اب اس حدیث کی قیمت سمجھ میں آئی ہے، جس میں اعزت علینا کے الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ
علیہ وسلم کے ان جذبات کا اظہار کیا گیا ہے جو ترک مکہ کے بعد اس کے ذکر سے آپ میں متلاطم ہونے لگتے
تھے، مرز و بوم کے ساتھ اِلفت اور اس کی طرف حنین کی عقلی توجیہ ممکن ہے نہ ہو سکے، جیسے اولاد کے
ساتھ غیر معمولی عطوفت بھی غیر موجہ ہے، مگر واقعہ کا کیسے انکار کیا جائے، اب تو پروگرام بنانے سے
دل الجھتا ہے، یہ کوئی دنیا ہے جس سے ہم گذر رہے ہیں، پہلے بھی منطقی تعلق بیان کے حوادث و واقعات
میں کیا تھا، اور اب تو للہ الواحد القہار کے ارادۂ قاہرہ کے سوا ہر سبب اپنی سببی جبلت کو
بھی کھو چکا ہے، بڑی بے رحمی کا ارتکاب ہندوستان کے اس بوڑھے پیر مرد کے ساتھ کیا گیا،
مارنے والے کا کوئی قصور اس بیچارے نے نہیں کیا تھا، میری سمجھ میں تو صرف اس آیت کی تفسیر اگر

قل لن ینفعکم الفرار من الموت او القتل۔ اب مامن کسے سمجھا جائے، کسی علاقہ کو فتح کرکے
دارالسلطنت میں اس کے بیٹھ کر بھی گولی کا نشانہ جب آدمی بن سکتا ہے، تو پھر این المفر واین المفر
میاں ہاشم سلمہ کا حال کیا لکھوں، مجھ میں اور ان میں یاجوج ماجوج کی دیوار کا سا معاملہ
ہو رہا ہے، رات بھر کی ساری محنت صبح کو وہ ضائع کر دیتے ہیں، میں وظیفہ کی کوشش کرتا ہوں،
اور ان کو اپنے ہوش حواس کی صحت کا چونکہ کامل یقین ہے اس لیے غور کی جد وجہد میں گھومتے ہیں،
کل پرسوں سے آکر مجھے یہ خوشخبری سنا رہے ہیں کہ اب مہدی یار جنگ بہادر نے ان کے تقرر
کا باضابطہ حکم دے دیا ہے، خدا کرے صحیح ہو، کئی دفعہ باور کرایا، مگر تحقیق نے غلط ثابت کیا،
ان کے بال بچوں کا حال سن کر کلیجہ کانپ گیا اللھم نعوذ بک من الحور بعد الکور، حالات
دیکھئے کیا ہوتے ہیں، میاں مکارم مجھے بلا رہے ہیں، فقط نیاز مند

مناظر احسن گیلانی

مولانا رضوان صاحب کو سلام فرما دیجئے، مولوی فضل صاحب سے معلوم ہوا کہ ان کے
گھر کی طبیعت تشویشناک حد تک پہنچی ہوئی ہے، معلوم نہیں اب کیا حال ہے، مولانا فضل کو سلام
پہنچا دیا تھا، جواب فرماتے ہیں۔

۱ر نومبر ۱۹۴۸ء

سیدی! ادام اللہ مجدکم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مولوی محمد علی صاحب اور میاں ہاشم کے خطوط میں تفقد حال فقیر کا جو فرمایا گیا، دل متاثر ہوا،
زندہ ہوں اور لا تاخذہ سنۃ ولا نوم کے ساتھ زندہ ہوں، جب بھیک (شفاعت) بھی
باذنہ کے بغیر ناممکن ہے تو اس جیتے جاگتے، ہمہ بیداری و ہمہ حکمت و علم کے ملک میں کسی دوسرے کا
ارادہ کس راہ سے گھس سکتا ہے، بیدہ الملک لہ الملک ولہ الحمد ونحن الوارثون۔

امید ہے کہ آپ بعافیت ہوں گے، مولوی فضل تو گئے ہیں، کیا راہ میں آپ کے پاس بھی ٹھہرے؟ مولوی عبد الباری مسلسل پوچھ رہے ہیں، اب کیا ارادہ ہے، میں لکھتا ہوں کہ کوئی ارادہ نہیں تو بگڑ جاتے ہیں، ابھی لکھا ہے کہ ترک ارادہ بھی تو ارادے کے وجود کو ثابت کرتا ہے، پھر جہاد میں مجھے شریک کیوں کرتے ہیں، کچھ سوچنا کبھی عقل ہی کا اقتضا ہو جاتا ہے، تو نعمتِ عقل کے کفران کا الزام اب کیوں دیتے ہیں، محکمات بینات، (لاتدری نفس ماذا تکسب غدا. ولا تدری نفس بای ارض تموت. کے بعد آپ ہی بتائیے کہ مولوی عبد الباری صاحب کو میں پھر کیسے بتاؤں کہ کل کیا کروں گا، اور کہاں جا کر مرنے کا ارادہ ہے۔ فقط

مولانا رضوان صاحب کو سلام فرما دیجیے۔

خاکسار مناظر احسن گیلانی

۲۳ رجب ۶۹ھ
یوم جمعہ
حیدر آباد دکن

سیدی: دمتم بالھناء والعافیہ. وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

نیاز نامہ کے جواب میں شفقت نامہ باعث ابتہاج وتشکر ہوا، حالات اتنے پیش آگئے ہیں کہ بجائے کچھ کہنے کے خاموشی ہی اولیٰ ہے، قومی بھی اور ذاتی بھی، برادری کے سوالات بھی، بس افوض امری الی اللہ ان اللہ بصیر بالعباد" الخیر فیما وقع وانشاء اللہ سیکون الخیر فیما سیقع فان اللہ عند ظن عبدی بی، شاید اس کا خیال آپ کو نہ رہا کہ موسم گرما کی تعطیل میں جامعہ بند ہے ورنہ مولانا فضل کو سلام اور ان سے استفسار نہ فرماتے، "فانہ خسٌ" کے مقام پر آجکل ہیں، آپ کو زبانی امتحان کے لیے تشریف لانے کی زحمت شاید ڈاکٹریٹ کے مقالے کے سلسلے میں دی گئی ہو، کالج کے بند ہونے کی وجہ سے کوئی خاص خبر اس سلسلہ میں نہیں دے سکتا،

ہفتہ ڈیڑھ ہفتہ میں جامعہ کا افتتاح ہوگا، پونے تین مہینے گرمی کی اس تعطیل کے غالباً پوری مدت ملازمت میں پہلی دفعہ حیدرآباد ہی میں گذارنے پر مجبور ہوا، گیلانی میں ابھی کوئی واپس نہیں ہوا ہے، گھر کے لوگ ساتھ تھے، پڑا رہا، اب کچھ خبریں ایسی آرہی ہیں کہ بتدریج لوگ رجوع کرنے کا تہیہ کر رہے ہیں، میاں مکارم اپنے اہل وعیال کے ساتھ استھانواں میں ہیں، دیکھیے اس مخنون پاکستان کے بعد بھی شورش فرو ہوتی ہے یا نہیں،

میری ملازمت کی مدت ستمبر کے مہینے میں پوری ہو رہی ہے، اس وقت تک کچھ نہیں معلوم کہ ارباب اقتدار کا کیا ارادہ ہے، امیر جامعہ جدید ولی محمد صاحب یورپ گئے ہیں، آنے کے بعد کچھ فیصلہ ہوگا، بھاولپور سے وزیر تعلیم کا تار آیا تھا کہ چند ہی دن کے لیے ایک دفعہ بھاولپور آکر دیکھ جاؤ، معذرت لکھ کر بھیجدی ہے،

ہاں صاحب اس وقت دراصل اس عریضہ کو اس خاص خبر کی وجہ سے لکھ رہا تھا، جس سے آپ نے مطلع فرمایا ہے، یعنی اہل وعیال کے ساتھ سفر حج، عجیب اتفاق ہے، میرے گھر کا بھی ہفتہ عشرہ سے اصرار ہو رہا ہے، کہ تم قرض سے سبکدوش ہوگئے، میں رہ گئی، مجھے لے چلو، لیکن اسی سال میری ملازمت کے فیصلہ کا زمانہ رہی ہے جب روانگی کی تیاری میں مسافر کو مشغول ہونا چاہیے، ٹکس اس سال خرچ کا تخمینہ اوسطاً کیا ہے، یعنی جہاز کے عرشہ اور فرسٹ کلاس دونوں کا، ہو سکے تو مطلع فرماتے، محرم کا قانون مانع نہ ہوتا تو آپکے قافلہ میں گھر کو شریک کردیتا، بے چارے ہاشم کا حال کیا عرض کروں، دیکھ کر دل کانپ جاتا ہے، وہ نوحہ غم ہیں، اور ہوش والوں کے لیے مصیبت بنے ہوئے ہیں، ممکن حد تک خبرگیری جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں، لیکن خود مجھ پر کافی بار ہے، فقط

والسلام مناظر احسن گیلانی۔

ثمر دانی کے متعلق کیا عرض کروں، مفتی صاحب ان پر سوار ہیں۔ اسلامی معاشیات میری کتاب شائع ہو گئی، عن قریب حاضر ہوگی، نصف حصہ اس کا غیر مطبوع تھا۔

سیدی و سید المسلمین   ادام اللہ عافیتکم   السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

اسی عریضہ کے ساتھ ایک اور نیاز نامہ منسلک ہے، میں نے وہ لکھا نہیں ہے، بلکہ لکھوایا گیا ہے،
الغریق یتشبث بکل حشیش بے چارے ڈاکٹر عثمان صاحب اپنی لڑکی کی پریشانیوں کو دیکھ کر بعض
دفعہ اس قدر از خود رفتہ ہو جاتے ہیں کہ مجھے جنون کا اندیشہ ہونے لگتا ہے، بس یوں سمجھئے کہ اسی جنون
کے سلسلے میں یہ خیال بھی ان کے دماغ میں آیا کہ خدا نے آپ کو بھوپال پہنچا دیا ہے، شاید انکی مشکل
کے حل کی کوئی صورت قدرت آپ کے ہاتھوں پیدا فرما دے، میں نے ان کو سمجھایا کہ اس سلسلہ میں
مولانا بے چارے کیا کر سکتے ہیں، لیکن انھوں نے کہا کہ تم لکھ کر تو دیکھو، آپ سے میں کیا عرض
کروں، حسبۃً للہ، ممکنہ حد تک ان کی جو امداد سرکاری، غیر سرکاری، ضابطہ، بے ضابطہ شکل میں
آپ یا مولانا رضوان صاحب کر سکتے ہوں تو کیجئے، کوئی شبہہ نہیں کہ بے چاری لڑکی حد سے زیادہ
مظلومہ ہے، مولانا عبد الباری اور فقیر نے ایک دفعہ اصرار کر کے لڑکی کو بھوپال جانے پر راضی
بھی کیا، گئی بھی، لیکن حالات بجائے سلجھنے کے اور الجھ گئے، اب اقتران کی شکل تو کوئی باقی
نہیں رہی ہے، افتراق کلی کا کوئی فائدہ نہیں، درمیانی راہ بھی ہو سکتی ہے، کہ گذارے کے لیے
ظالم شوہر کی تنخواہ سے کچھ رقم اس بیچاری تک ماہ بماہ پہنچ جائے۔ فیصلہ بھی ہو گیا، حکم بھی
دیا گیا، لیکن تعمیل کون کرے، کوئی صورت تعمیل کی نکل سکتی ہو تو اسے سوچئے، اللہ واسطے
کا کام ہے، مومن کی کشفِ کربت کا مسئلہ ہے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے، آنکھ کی شکایت کا ازالہ ہو چکا ہوگا، خاکسار پر اس
شبخوں حملے کے بعد بحمد اللہ کوئی دوسرا حملہ نہیں ہوا، لیکن ایک ہی حملہ میں کس بل نکل گیا،
ایک مہینہ گوشہ نشین رہا، ایک ہفتے سے کالج آرہا ہوں، اب میری مدت ملازمت کل ایک
مہینہ باقی ہے، یہاں کے حالات جیسے تھے، ان کو دیکھتے ہوئے تو یہی خیال تھا اور ابھی اس

خیال سے نپٹنے کی کوئی بیّن وجہ سامنے نہیں آئی ہے، مولوی عبد الباری صاحب جیسی شخصیت
کے ساتھ جب بے نیازی کا وہ سلوک کیا گیا، تو فقیر کس کھیت کی مولی ہے، جو میرا خیال
کیا جائے گا، لیکن تین چار دن سے کچھ خبریں ایسی مل رہی ہیں کہ ارباب حل و عقد کو چونکہ
سردست کوئی دوسرا آدمی نہیں مل رہا ہے، اس لیے کچھ دن کی توسیع کر دینے کا
خیال کیا گیا ہے۔

میں عجیب کش مکش میں ہوں، سارا خواب پریشاں ہو کر رہ گیا، سوچے ہوئے
تھا کہ وظیفہ لے کر گیلانی چلا جاؤں گا، پھر وہیں سے دوسرے خدمات کا سلسلہ اگر میسر آئیگا،
شروع کروں گا، پھر وہیں اپنے آبا واجداد کے ساتھ سو جاؤنگا، لیکن اب کہاں جاؤں؟
کچھ ادھر اطمینان کی خبریں بہار سے آنے لگی تھیں کہ پھر اچانک حکومت کے اس طرزِ عمل
کی خبریں مل رہی ہیں کہ کسی قسم کا کوئی حادثہ ہو، حکومت نے طے کر دیا ہے کہ اس میں مسلمانوں
کو مجرم قرار دے کر ان کی آبرو ریزی کی جائے، واقعات کا علم ہوا ہوگا، بڑے بڑوں کے
سر کی پگڑی اتاری جا رہی ہے، ایسی حالت میں بہار کے تو خیال سے رونگٹے کھڑے ہوتے
ہیں، مگر پھر کہاں قیام کیا جائے؟ دکن کا حال کیا بیان کروں؟ بس اللہ ہی اللہ ہے،
کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کل کیا ہوگا؟ پنجاب کی حالت سن سن کر کلیجہ منہ کو چلا آتا ہے، ریاستوں
کا یہ حال، غیر ریاستی علاقے اس حال میں۔ فتنۂ تاتار میں مسلمانوں پر کیا گذری تھی، اب
اس کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ ہو رہا ہے، مولوی فضل صاحب سے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کی
مدت ملازمت مئی میں ختم ہو گئی تھی، اور توسیع بھی ابھی نہیں ہوئی ہے، شروانی صاحب کا خط
میرے نام بھی آیا تھا جس میں علی گڈھ آنے کی دعوت دی گئی تھی، لیکن مجھے تو ان کی تحریروں
میں اب "خرافت" کا اثر محسوس ہوتا ہے، محدثین پر جب آخر عمر میں یہ حالت طاری ہو جاتی تھی

تو ان پر کیوں تعجب کیا جائے،

ہاں صاحب ابھی یہ خط لکھ ہی رہا تھا کہ اسی زمانہ میں اچانک بھوپال سے ایک طویل و عریض و گبھن لفافہ رجسٹرڈ موصول ہوا، کھولا تو معلوم ہوا کہ زبیری صاحب کا ہے، دار المصنفین سے "اعتزل عنا" کا جو فیصلہ ان کے متعلق کیا گیا تھا، اسی کے متعلق مجھ سے سوال تھا کہ جس جرم کا مجرم مجھے ٹھہرایا گیا ہے، اور جن صاحب کی وجہ سے ٹھرایا گیا ہے، اس جرم کے سب سے بڑے مجرم تو وہی تھے، بلکہ پہلے آدمی وہ ہیں جنھوں نے الموتی کے متعلق ذکر بالشر کو تحقیق کا ایک اہم فریضہ قرار دیا تھا، اس سلسلہ میں بیسیوں کے چند افراد ما تون سعدی حافظ امیر خسرو کے متعلق مولوی شبلی صاحب کی عبارتیں نقل کر کے بھیجی ہیں، میں تو یہی جواب دے رہا ہوں کہ غلطی کا جواب غلطی نہیں ہے، یا کیا لکھوں - فقط

والسلام

مناظر احسن گیلانی

تین نایاب معائنے

از جناب رئیس مینائی مسلم لائبریری بنگلور

بنگلور اردو کے مراکز سے دور ہونے کے باوجود ادب کی جو خدمات انجام دے رہا ہے وہ نظر انداز کرنے کے قابل نہیں ہیں، چنانچہ علم و ادب کی نشر و اشاعت کے لیے اہل بنگلور نے ۱۹۱۲ء میں ایک کتبخانہ اور دار المطالعہ مسلم لائبریری کے نام سے قائم کیا، جس میں اردو، انگریزی اور تامل کتابوں کا کافی ذخیرہ مہیا کیا، اس کے علاوہ عہد ٹیپو کی بعض نایاب و نادر قلمی کتابیں جمع کیں، اس وقت اس لائبریری میں تقریباً، ہزار کتابیں ہیں، اور دار المطالعہ کے لیے ہند و پاک کے اکثر معیاری رسائل و جرائد آتے ہیں، اور جو اکابر علم و فن اور مشاہیر شعر و سخن بنگلور تشریف لاتے ہیں وہ لائبریری کو اپنے قدم میمنت لزوم سے نوازتے ہیں، اور گرانقدر آراء سے اوراسے کی قدردانی فرماتے ہیں، ذیل میں ڈاکٹر اقبالؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ کی تین غیر مطبوعہ تحریریں پیش کیجاتی ہیں:-

(۱) تحریر ڈاکٹر اقبال

"جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوانوں اور خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا جو احساس پیدا ہو چکا ہے جسکو میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نیک فال تصور کرتا ہوں. میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور مسلم لائبریری نے اس احساس کے پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے،

اور امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائیگا، اراکین کتب خانہ کو چاہیے کہ تاریخ میسور کے قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ کریں۔

محمد اقبال ۹ر جنوری سنہ ۱۹۲۹ء

مستقر بنگلور

(۲) تحریر علامہ سید سلیمان ندوی

"آج مجھے مسلم لائبریری کو دیکھکر بہت خوشی ہوئی، مسلمان نوجوانوں میں قومیت کی اشاعت اور صحیح خیالات کی تبلیغ، مذہب و ثقیفت علم سے ذوق اور ادب و زبان کے شوق کا یہی ذریعہ ہے کہ ہر جگہ دار المطالعے قائم کیے جائیں، یہ لائبریری تیرہ سال سے قائم ہے اور یہ سب سے بڑی دلیل اسکی زندگی کی ہے، عموماً مسلمانوں کا کام مستقل نہیں ہوتا، لیکن اس لائبریری کا اتنے سالوں تک قائم رہنا آیندہ ضمانت ہے، اور اسکے ممبروں کی کوشش و محنت کو ثابت کرتا ہے، اس لائبریری میں ملک کے تمام اچھے اخبارات آتے ہیں، اسکے ۱۵۰ ممبر ہیں، ۹ سو کتابیں اسکی ملکیت میں ہیں، غرض ہر حیثیت سے یہ لائبریری قابل تعریف ہے اور سزاوار تحسین ہے، امید ہے کہ اسکے ذریعہ سے یہاں اردو کی اشاعت بخوبی ہوسکے گی۔" والسلام

سید سلیمان ندوی ، ۲۲ اکتوبر ۱۹۲۵ء

(۳) تحریر مولانا ظفر علی خاں

"مجھے آج بتاریخ یکم ستمبر ۱۹۳۱ء مسلم لائبریری کے معائنہ کا شرف حاصل ہوا جو مسلمانان بنگلور کے ذوق علمی کی زندہ شہادت ہے، ایک ہزار سے اوپر مختلف فنون کی کتابیں اس کتب خانہ میں موجود ہیں، اور متعدد اردو اور انگریزی اخبارات بھی منگائے جاتے ہیں، جن سے اخباربیں حضرات فائدہ اٹھاتے ہیں، کتب خانہ بہت کچھ توسیع کا محتاج ہے اور وہ تمام مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تصانیف جو سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ علیہ کی حیات مبارک پر روشنی ڈالتی ہوں، خواہ انگریزی میں ہوں خواہ فرانسیسی میں، خواہ فارسی میں خواہ کسی اور زبان میں، اس کتب خانے کا سرمایۂ امتیاز ہونی چاہئیں، امید کہ کارپرداز ان کتب خانہ اس ضرورت کو جلد پورا کریں گے، اخبارات انگریزی میں مجھے بمبئی کرانیکل نظر نہ آیا، جو اپنی ادبی دلچسپیوں اور صحیح ذوق سیاسی کے لحاظ سے ہر ترقی یافتہ دار المطالعہ کی زینت ہوسکتا ہے، اردو اخبارات میں مدینہ، الجمعیۃ، اور تاج[1] پر زمیندار کا بھی اضافہ کیا جاسکتا ہے، تاکہ اس کے آراء و افکار سے بھی ارباب نظر آشنا رہیں۔"

ظفر علی خاں بنگلور

---

[1] اس اخبار کے اڈیٹر جناب سید عبد اللہ بریلوی تھے، (م - م)

ادبیات

اقبال

از جناب عبد الرؤف صاحب ایم اے لکچرار شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی

وہ شاعر آتش نفس وہ عاشق جمہور
جو شمع کے مانند ہے پر سوز و ضیا بار

وہ بحر معانی ... کا جگر دار شناور
موجوں کو سمجھتا رہا اک ساحل ہموار

بے کیف بھی، بے جان بھی اشعار کی دنیا
تقلید میں الجھی ہوئی لفظوں میں گرفتار

افسردہ بھی شاعر کی نوا کم نگہی سے
بیزار ابھی زیست اس سے تو وہ زیست سے بیزار

اقبال کہ تخلیق کے جذبے سے تھا سرشار
گفتار کا غازی نہ تھا وہ صاحب کردار

اک تازہ جہاں شعر میں پیدا کیا اس نے
گرمیٔ معانی سے دمکنے لگے افکار

وہ کیف وہ سرمستی میں ڈوبے ہوئے نغمے
وہ صبح کی مانند نکھرتے ہوئے اشعار

انداز بیاں دل میں اتر جانے کے لائق
جیسے کسی سلمیٰ کا تبسم دم گفتار

تفسیر حیات اس نے لکھی خون جگر سے
پر سوز ہوئے دل صفت لالۂ کہسار

یکتائے زمانہ تھا وہ حکمت میں جنوں میں
دیوانے کا دیوانہ تھا ہشیار کا ہشیار

محرم تھا وہ فطرت کے سر و راز ازلی کا
دریا کی روانی اسے کرسکتی بھی سرشار

وہ ذوق تکلم اسے فطرت سے ملا تھا
کرتا تھا وہ پھولوں کو عطا شوخیٔ گفتار

سنتا تھا ہر اک شے میں وہ پیغام مشیت
ہوں لالہ و گل دشت و دمن یا در و دیوار

دنیائے محبت کا مجدد اسے کہیے
تھا جذب نیا اس کا نیا حسن کا معیار

محدود نہ تھا اسکا جنوں کوئے بتاں تک
تھے زد میں سبھی دشت و چمن ثابت و سیار

کی اس نے نئے طرز سے یوں شرح خودی کی
پوشیدہ جو اب تک تھے ہوئے فاش وہ اسرار

بازوئے علیؓ، جوشِ عمرؓ، صدقِ ابوبکرؓ
کیا کیا نہ عطا کرتی رہی عشق کی سرکار

جس عشق کی عظمت کا تھا اقبال ثنا خواں
اس عشق سے روشن تھا دلِ احمد مختار ؐ

مجموعۂ اضداد تھا اقبال یہ سچ ہے
اس طرح کہ جذبات نہ تھے تابعِ افکار

تھا جذبۂ دل راہنما فکر و نظر کا
اور فکر و نظر سوز محبت کی طلبگار

وہ صاحب اسرار خودی مست مئے شوق
بے خود بھی رہا اور خودی کا بھی نگہدار

ہرگز نہ تھا مقصود یہ تلقینِ خودی سے
خود سر بنے انسان خودی کا ہو پرستار

محروم تھی مشرق کی زمیں سوز خودی سے
ہر سمت اندھیرا تھا تہِ مطلعِ انوار

تو میدی جاوید دلوں پر تھی مسلط
کچھ فکر میں تابش تھی نہ کچھ گرمیٔ افکار

اقبال نے بروقت کیا فاش یہ نکتہ
کچھ کام نہ آئے گی یہ تسبیح یہ زنار

بیدار نہ کرتا ہو جو انساں کی خودی کو
فرسودہ ہے وہ فلسفہ وہ وعظ ہے بیکار

خوگر نہیں ہوتی وہ غلامی کی کبھی بھی
خود دار ہو جو قوم خودی جس کی ہو بیدار

شعر العجم حصہ پنجم

اس میں قصیدہ، غزل اور فارسی زبان کی عشقیہ، صوفیانہ اور اخلاقی شاعری پر تنقید و تبصرہ ہے۔ قیمت ۸۰ ر

(مؤلفہ علامہ شبلی نعمانی)

مطبوعات جدیدہ

تذکرہ مخدوم جہانیاں جہاں گشت: از سخاوت مرزا صاحب، صفحات ۳۰۰، کتابت و طباعت متوسط، ناشر انسٹی ٹیوٹ آف انڈو مڈل ایسٹ کلچرل اسٹڈیز، حیدر آباد دکن۔

سرزمین ہند میں جن بزرگوں کی کوششوں سے اسلام کی روشنی پھیلی ان میں ایک سید جلال الدین مخدوم جہانیاں جہاں گشت بھی ہیں، یوں تو مخدوم صاحب کا فیض ہندوستان کے ہر گوشے اور ہر خطے میں پہنچا، مگر انکی دینی و اصلاحی کوششوں کا سب سے بڑا مرکز دکن تھا۔ شیخ کے حالات پر اب تک اردو میں کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اب جناب سخاوت مرزا صاحب نے اس فرض کو ادا کیا ہے، کتاب بڑی تحقیق سے لکھی گئی ہے، اور شیخ کی زندگی کے ہر گوشہ پر مستند تذکروں کے بیانات سے روشنی ڈالی گئی ہے،

شیخ نے گو پوری زندگی سیر و سیاحت میں بسر کی چنانچہ ان کا لقب ہی جہانیاں جہاں گشت پڑ گیا، اس کے باوجود آپ کی تصانیف کی تعداد تین سو سے زیادہ ہے، مصنف نے ان کی تمام مطبوعہ کتابوں کے نام دیدیے ہیں، مصنف نے بڑی تحقیق سے شیخ کا تذکرہ مرتب کیا ہے، اس سے اردو تذکروں میں ایک عمدہ اضافہ ہوا ہے۔

عبقات (عربی) از شاہ محمد اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ، ضخامت ۲۳۶ صفحات، ٹائپ عمدہ، ناشر المجلس العلمی، پوسٹ بکس نمبر ۳۸۸۳ میری ویدر ٹاور کراچی ۲

اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ اپنے علم و عمل میں صحابۂ کرام کی یادگار تھے، ایک طرف وہ

سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی تحریکِ جہاد کے سپہ سالارِ اعظم تھے، تو دوسری طرف وہ علم وفن میں خانوادۂ ولی اللہی کی زندہ یادگار تھے، تیسری طرف راہ احسان وتزکیۂ نفس کے نہ صرف سالک بلکہ اس کے امام تھے، انھوں نے عمر بہت کم پائی، اور پھر ان کی عمر کا ایک بڑا اور قیمتی حصہ میدان جہاد میں گذرا، اور آخر میں اسی راہ میں شہادت نصیب ہوئی، مگر علم وفضل اور احسان وسلوک سے طبعی وفطری مناسبت تھی، اس لیے بڑی سے بڑی مشغولیت میں بھی ان کا قلم اور طبیعت رواں دواں رہتی تھی، اگر وہ یکسو ہو کر اس کام کی جانب توجہ کرتے تو اپنے اسلاف کی یاد تازہ کرتے، مگر پھر بھی جو علمی یادگاریں انھوں نے چھوڑی ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں، انہی میں ایک عبقات بھی ہے، عبقات در اصل ان تمام معارف وحقائق کا خلاصہ ہے، جو شیخ ابن عربی، مجدد الف ثانی، اور شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کی گراں قدر تصانیف میں بکھرے ہوئے ہیں، خود حضرت شہیدؒ نے مقدمۂ کتاب میں ان کا ذکر کیا ہے، یہ کتاب چار مباحث پر مشتمل ہے، وجود، تجلّی، ایجاب واختیار، اور مراتب نفس، ان میں بعض مباحث ایسے ہیں جو جدید فلسفہ اور طبعیات کے لیے دلچسپی کا سبب ہو سکتے ہیں، اس میں یونانی اور سوفسطائی فلسفہ کا بھی کہیں کہیں جائزہ لیا گیا ہے، یہ حسن اتفاق ہے کہ اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم جیسے معارف شناس کے قلم سے شائع ہو گیا ہے، ترجمہ کے شائع کرنے کی سعادت لجنۃ العلمیہ چنچل گوڑہ حیدر آباد کو ہوئی ہے، مگر اصل کتاب اور اس کا ترجمہ صرف خواص اہل علم بلکہ اخص خواص اہل علم کے فائدہ اٹھانے کی چیز ہے۔

اسلامی اصول صحت : از فضل کریم فاروقی، صفحات ۲۲۰، کاغذ، کتابت و طباعت معمولی، ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، قیمت ۳ر

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اور اس نے انسانی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر مقام کے لیے اخلاقی و

قانونی ضابطہ دیا ہے، انسان کی بے شمار ضروریات میں ایک اہم ضرورت صحت وصفائی بھی ہے، اسی پر انسان کے مادی اور اخلاقی وجود کے بقا کا دار ومدار ہے، اسلام نے صحت وصفائی کے جتنے ہمہ گیر، فطری وحقیقی اصول بتائے ہیں، اس کی نظیر کسی دوسرے مذہب اور کسی معاشرہ میں نہیں ملتی، اس کی حس اس سلسلہ میں اتنی تیز ہے کہ وہ پیشاب کی ایک چھینٹ کی گندگی بھی برداشت نہیں کرتا، اس کی عبادت کی پہلی شرط طہارت وصفائی ہے، البتہ اس نے اس سلسلہ میں اسراف اور بیجا تکلف سے روکا ہے، مصنف نے اس کتاب میں قرآن وسنت کی روشنی میں اسلامی اصول صحت وصفائی کی بڑی شگفتہ انداز میں وضاحت کی ہے، اس موضوع پر اردو میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے، لیکن کہیں کہیں زمانہ کے مذاق کا لحاظ نہیں رکھا گیا ہے۔

تاریخ تصوف قبل از اسلام : از بشیر احمد ڈار، صفحات ۲۲۲، کتابت وطباعت متوسط، ناشر ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور، قیمت للعہ

احسان وتزکیۂ نفس کا دوسرا نام تصوف ہے، اپنے نام کے اعتبار سے یہ ایک نو پیدا چیز ہے، مگر اس کی روح تمام انبیاءؑ کی تعلیمات کا اہم جزء رہی ہے، اور انبیاءؑ کے اثر سے دنیا کے تمام مفکرین وفلاسفہ کے افکار میں اس کے اثرات ملتے ہیں، اور ان فلاسفہ یا مفکرین نے جہاں جہاں اس میں بے اعتدالی پیدا کی تھی، اسلام نے اس کو دور کر کے اس کی اصل روح کو محفوظ کر لیا ہے، اس کتاب میں مصنف نے انہی تمام منتشر اجزاء کو تاریخی حیثیت سے جمع کرنے کی کوشش کی ہے، شروع کتاب میں ایک مختصر مقدمہ ہے، جس میں تصوف کی حیثیت اور زندگی میں اس کے مقام پر بحث کی گئی ہے، بعض رایوں سے اختلاف کے باوجود مقدمہ سلجھا ہوا ہے،

غالب فکر وفن : از ڈاکٹر سبزواری، صفحات ۲۶۴، کتابت وطباعت متوسط،

ناشر کل پاکستان انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی ۱

اردو زبان کے مشہور محقق و اہل قلم ڈاکٹر سبزواری صاحب نے کئی سال پہلے فکر و فن پر متعدد تحقیقی مضامین لکھے تھے، اب یہی مضامین کتاب کی شکل میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوتے ہیں، اس کتاب کا مقصد مصنف نے یہ بیان کیا ہے "فکر غالب کی گہرائی اور پہنائی کے جلوے دکھا کر اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو کا شاعر شاعر ہی نہیں ہوتا، فن کے اسرار، علم کے نکات اور حیات کائنات کے حقائق پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے۔" اس مقصد میں مصنف پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے ان لوگوں کا بھی محققانہ جواب دیا ہے جن لوگوں کے نزدیک غالب محض ایک شاعر، انشاء پرداز اور ادیب تھے اور ان میں کوئی تحقیقی صلاحیت نہ تھی۔

ترکی نظام طب کی تاریخ - از ڈاکٹر سہیل انور ایم ڈی، ترجمہ نیر واسطی،

صفحات ۴۴ کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مجلس ابو علی سینا، لاہور، قیمت عہ

فن طب کی ترویج و ترقی میں جن ممالک کا حصہ رہا ہے ان میں عام طور پر اسکندریہ، انطاکیہ، الرہا، جندی شاپور اور بغداد وغیرہ کا ذکر تو کیا جاتا ہے، مگر ترکی کا نام نمایاں طور پر نہیں آتا، حالانکہ یہاں فن طب کی بڑی خدمت ہوئی ہے، اور علمی، فنی اور عملی لحاظ سے اس میں بڑا اضافہ ہوا ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک ترک مصنف سہیل انور نے انگریزی زبان میں یہ مختصر رسالہ اوریجنز آف ٹرکس ہسٹری آف میڈیسن کے نام سے لکھا تھا، زیر تبصرہ رسالہ اسی کا اردو ترجمہ ہے، جسے نیر واسطی صاحب نے کیا ہے، اس رسالہ سے ترکوں کی طبی خدمات پر پورے طور پر روشنی پڑتی ہے، یہ رسالہ بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر کا مصداق ہے، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"م، ج"

جلد ۹۲ - ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء - عدد ۳

مضامین

اطلاع

جناب سید تقی احمد صاحب لکچرار سندھ یونیورسٹی حیدر آباد (مغربی پاکستان) گرمیوں کی چھٹی میں حیدر آباد سے باہر تھے، اس لیے انکی عدم موجودگی میں جو منی آرڈر بھیجے گئے وہ واپس ہو گئے، اب وہ حیدر آباد (مغربی پاکستان) پہنچ گئے ہیں، اس لیے معارف کے پاکستانی خریدار اب معارف کا چندہ مبلغ [illegible] ان کے پتہ پر مہربانی کرکے منی آرڈر کر دیں۔

پاکستان میں روپیہ جمع کرنے کا انتظام ہو جانے کے باوجود ہمارے بعض خریدار روپئے نہیں بھیج رہے ہیں جسکی وجہ سے بقایا بڑھتا چلا جا رہا ہے، امید ہے کہ وہ آئندہ اسکا خاص طور سے خیال کرینگے، اور ذیل کے پتہ پر اپنا روپیہ بھیجکر ہم کو ممنون کرینگے۔

پتہ:- جناب سید تقی احمد صاحب لکچرار سندھ یونیورسٹی حیدر آباد (مغربی پاکستان)

منیجر

ناشر کل پاکستان انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی عما

اردو زبان کے مشہور محقق و اہل قلم ڈاکٹر سبزواری صاحب نے کئی سال پہلے فکر و فن پر متعدد تحقیقی مضامین لکھے تھے، اب یہی مضامین کتاب کی شکل میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوتے ہیں، اس کتاب کا مقصد مصنف نے یہ بیان کیا ہے "فکر غالب کی گہرائی اور پہنائی کے جلوے دکھا کر اس امر کو واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اردو کا شاعر شاعر ہی نہیں ہوتا، فن کے اسرار، علم کے نکات اور حیات کائنات کے حقائق پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے۔" اس مقصد میں مصنف پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں، اور اس سلسلہ میں انھوں نے ان لوگوں کا بھی محققانہ جواب دیا ہے جن لوگوں کے نزدیک غالب محض ایک شاعر، انشاپرداز اور ادیب تھے اور ان میں کوئی تحقیقی صلاحیت نہ تھی۔

ترکی نظام طب کی تاریخ ۔ از ڈاکٹر سہیل انور ایم ڈی، ترجمہ نیر واسطی،

صفحات ۴۴، کتابت و طباعت عمدہ، ناشر مجلس ابو علی سینا، لاہور، قیمت عہ

فن طب کی ترویج و ترقی میں جن ممالک کا حصہ رہا ہے ان میں عام طور پر اسکندریہ، انطاکیہ، الرہا، جندی شاپور اور بغداد وغیرہ کا ذکر تو کیا جاتا ہے، مگر ترکی کا نام نمایاں طور پر نہیں آتا، حالانکہ یہاں فن طب کی بڑی خدمت ہوئی ہے، اور علمی، فنی اور عملی لحاظ سے اس میں بڑا اضافہ ہوا ہے، اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک ترک مصنف سہیل انور نے انگریزی زبان میں یہ مختصر رسالہ اوریجنز آف ٹرکس ہسٹری آف میڈیسن کے نام سے لکھا تھا، زیر تبصرہ رسالہ اسی کا اردو ترجمہ ہے، جسے نیر واسطی صاحب نے کیا ہے، اس رسالہ سے ترکوں کی طبی خدمات پر پورے طور پر روشنی پڑتی ہے، یہ رسالہ بہ قامت کہتر اور بہ قیمت بہتر کا مصداق ہے، اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اس کا مطالعہ دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"م، ج"

جلد ۹۲۔ ماہ ربیع الثانی ۱۳۸۳ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۶۳ء۔ عدد ۳

مضامین

اطلاع

جناب سخی احمد صاحب لکچرار سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (مغربی پاکستان) گرمیوں کی چھٹی میں حیدرآباد سے باہر تھے، اس لیے انکی عدم موجودگی میں جو منی آرڈر بھیجے گئے وہ واپس ہوگئے، اب وہ حیدرآباد (مغربی پاکستان) پہنچ گئے ہیں، اس لیے معارف کے پاکستانی خریدار اب معارف کا چندہ مبلغ ۸ روپیہ ان کے پتہ پر مہربانی کرکے منی آرڈر کر دیں۔

پاکستان میں روپیہ جمع کرنے کا انتظام ہو جانے کے باوجود ہمارے بعض خریدار روپئے نہیں بھیج رہے ہیں جسکی وجہ سے بقایا بڑھتا چلا جا رہا ہے، امید ہے کہ وہ آئندہ اسکا خاص طور سے خیال کرینگے، اور ذیل کے پتہ پر اپنا روپیہ بھیجکر ہم کو ممنون کرینگے۔

پتہ :- جناب سید سخی احمد صاحب لکچرار سندھ یونیورسٹی حیدرآباد (مغربی پاکستان)

منیجر